اکتوبر 2005

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

2 اکتوبر 1869 — 30 جنوری 1948

قومی اردو کونسل کی جانب سے 27 اگست 2005 کو الائنس فرانسز آڈیٹوریم، لودھی اسٹیٹ، نئی دہلی میں اردو کے معروف ادیب وشاعر اور فلم ساز جناب گلزار اور پارسی تھیئٹر سے وابستہ ممتاز فنکار محمد احمد انجم دہلوی کے اعزاز میں ایک ثقافتی شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب گلزار، جناب محمد احمد انجم دہلوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور جناب انیس اعظمی کے علاوہ دیگر حاضرین کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ثقافتی پروگرام میں دہلی کی متعدد مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر ریاض پنجابی، پروفیسر مشیر الحسن وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی،
ڈاکٹر رخشندہ جلیل میڈیا کوآرڈینیٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور دیگر شرکا۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔10 اکتوبر 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159

ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● محمد علی اشرف فاطمی سے گفتگو .... ایم این شاہنواز 6
● اردو کا نیا مرکز ــــ جنوبی ہند .... محمود فاروقی 12
● فاصلاتی نظام تعلیم اور اردو زبان .... پرویز شہریار 13
● اردو صحافت کے مسائل .... سہیل انجم 16
● رسالہ "رہنمائے تعلیم" کا ادبی سفر .... رام پرکاش کپور 18
● اشاعتی ادارے اور اردو ناشرین کی ذمے داریاں .... محمد عارف اقبال 20
● مہاتما گاندھی اور سیکولر ریاست .... محمد محمود فیض آبادی 24
● قرونِ وسطیٰ کے چند مشہور جغرافیہ داں .... انور ادیب 26
● صنعت و حرفت .... مدحت لقمان 28
● بخار ــــ فصل خریف کی عام بیماری .... حکیم اشہر قدیر 30

اتہاس کے جھروکے سے:
● مغل سلطنت کا قیام .... مدن گوپال 32

گوشۂ ادب:
● گمشدہ آدرش (گاندھی جی کی یاد میں ایک نظم) .... مخمور سعیدی 36
● ابوالکلام قاسمی سے گفتگو .... مشتاق صدف 37

گوشۂ فروغ کتب
● شخصیت، کردار اور مزاج ("انسانی شخصیت کے اسرار و رموز" سے اقتباس) ساجدہ زیدی 41
● اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فن تاریخ نگاری
("ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورخین" سے اقتباس) .... ظہیر الدین ملک 47

طلبہ کے لیے
● سول سروس امتحانات کے لیے اردو زبان و ادب کی تیاری .... صفدر امام قادری 55
● کیا آپ C ہیں؟ .... پنیت نیر، استوتی ریحان 58
● اردو زبان و ادب (کوئز) .... محمد فیروز 61
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-27) .... محمد مسرور سعید 64

اردو خبر نامہ .... ادارہ 65

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73
● کلیات پریم چند (جلد سولہ) / مدن گوپال .... مبصر: شبنم آرا
● ادبیات شناسی / محمد حسن .... مبصر: عظیم امروہوی
● اللہ کے مقدس نام / پرویز دیوان .... مبصر: جاوید رحمانی
● معلوم نامعلوم / شاعر: نشتر خانقاہی .... مبصر: مخمور سعیدی
● تلخ و شیریں / ابرار رحمانی .... مبصر: ابوظہیر ربانی

بچوں کا گوشہ
● اجگر ("ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ" (حصہ دوم) سے کہانی) .... شنکر 77

آپ کی بات

■ کے. پی. شمس الدین، اردو ٹیچر اے. ایم. ہائی اسکول، ترورکنڈ، ملاپورم، کیرالا-679351

ماہنامہ ''اردو دنیا'' ستمبر کے شمارے میں ''آپ کی بات'' کے تحت کے. سی. عطاء اللہ خاں سنجری صاحب کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ انھوں نے خاکسار کے مضمون ''کیرالا میں اردو'' (مطبوعہ جولائی 2005) کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس کی کمیوں کی نشاندہی کی۔

''کیرالا میں اردو'' مفصل تاریخ نہیں ہے یونیورسٹی، کالج اور اسکول سطح پر اردو کا ماضی اور حال ایک الگ موضوع ہے اس لیے میں نے مضمون میں ان باتوں کا تفصیلی جائزہ پیش نہیں کیا۔ کالی کٹ یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں میں اردو، اردو ادیب فاضل کورس، کنور یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں میں اردو، سنسکرت یونیورسٹی میں اردو اور برنن کالج، فاروق کالج، گورنمنٹ کالج ملاپرم، سرسید کالج، این. اے. ایم کالج کلی کنڈی میں شعبۂ اردو کا تذکرہ یا تفصیلی جائزہ میں نے پیش نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ کیرالا میں کالی کٹ یونیورسٹی سے پی. ایچ. ڈی. کرنے والی صفیہ بی سنسکرت یونیورسٹی سے پی. ایچ. ڈی. کرنے والے حسو، مظہر قیصر، بشیر الحق قریشی، سلیم، بکولن، عبدالغفار کا بھی میں نے تذکرہ نہیں کیا کیونکہ یہ ایک الگ موضوع ہے۔

مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ ''ایس. سی. ای. آر. ٹی. کے سابق اردو ریسرچ آفیسر کے. عبدالغفور نے ''کیرالا میں اردو کی صورت حال'' پر پی. ایچ. ڈی. کیا ہے'' یہ بیان غلط ہے۔ کے. عبدالغفور صاحب نے کولکاتا کے ڈیم ڈیشنل یونیورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف الٹرنیٹو میڈی سنس سے ڈاکٹر ایس. کے. اگروال کی نگرانی میں 2004 میں "Clinical Psychology" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ فی الوقت کے. عبدالغفور صاحب Mokkam Educational District کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ہیں۔ عطاء اللہ صاحب کی دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ''برنن کالج کے صدر شعبۂ اردو جناب ای. محمد نے ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ پیش کیا ہے جبکہ ای. محمد صاحب نے اب تک پی. ایچ. ڈی. کے لیے رجسٹریشن تک نہیں کرایا ہے۔ البتہ انھوں نے ''اردو زبان و ادب کا ارتقا کیرالا میں 1947 کے بعد'' موضوع پر مدراس یونیورسٹی سے ڈاکٹر صفی اللہ کی نگرانی میں 1993 میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔

■ شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، زیب منزل، مشیر آباد، حیدرآباد-43

''اردو دنیا'' کا اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر ممتاز ماہر تعلیم، نامور اسلامی اسکالر، معتبر صحافی اور با اصول سیاستداں مرحوم ڈاکٹر رفیق زکریا کی تصویر دیکھ کر دل سوگوار ہو گیا۔ رفیق زکریا صاحب نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے فروغ، مسلمانوں کے مذہبی، علمی، سماجی اور سیاسی مسائل کے حل اور بالخصوص مسلمانوں کی بین الاقوامی شناخت بہتر بنانے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

زیر نظر شمارے میں اردو سے متعلق پروفیسر اے. ایم پٹھان، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور جناب زبیر رضوی کے مضامین خوب ہیں۔ جناب سہیل انجم کا ''اداریہ نویسی'' بھی فن اداریہ نویسی سے بخوبی واقف کراتا ہے۔

فیروز بخت احمد نے اپنے مضمون میں ''بچوں کے ادب'' کے سلسلے میں ہماری بے توجہی کی جانب جو اشارہ کیا ہے وہ صد فی صد حقائق پر مبنی ہے۔ اتنے اچھے مضامین کی اشاعت کے لیے میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کونسل کی جانب سے ادب اطفال سے متعلق 125 کتابوں کے اردو تراجم اور ''اردو دنیا'' میں ہر ماہ ''بچوں کا گوشہ'' کی اشاعت دونوں آپ کے اس جذبۂ احسن کی روشن دلیل ہیں۔ اس بار جناب اظہار احمد ندیم کا پروفیسر شمیم حنفی سے لیا گیا انٹرویو بھی خوب ہے۔ زیر نظر شمارے میں منیب الرحمان کی نظم یہ ''گھر'' نے بھی بے حد متاثر کیا۔ ان دنوں اپنے بزرگوں کے ساتھ نئی نسل کی لاپروائی واقعی تشویشناک ہے۔

■ ڈاکٹر مشتاق احمد، مدیر ''جہان اردو'' رحم گنج، دربھنگہ-846004 (بہار)

''اردو دنیا'' مسلسل موصول ہو رہا ہے۔ آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے اور رسالہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ ہر شمارہ پہلے شمارے سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر علوم پر معلوماتی مضامین اس کی قدر و قیمت میں نہ صرف چار چاند لگاتے ہیں بلکہ اسے دیگر رسائل سے منفرد بھی بناتے ہیں۔

ستمبر 2005 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ حسب روایت یہ شمارہ بھی قابل توجہ ہے۔ اگر واقعی اردو کے طلبہ ترجمے اور صحافت میں مہارت حاصل کر لیں تو ان کے لیے روزگار کوئی مسئلہ نہیں رہ جائے گا۔ مولا بخش صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ اب اردو کو عالمی سطح پر قبولیت کا درجہ حاصل ہے اور اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں لیکن تلخ سچائی یہ بھی ہے کہ پرانی بستیاں ویران ہو رہی ہیں۔ اتر پردیش سمیت دیگر ہندی علاقے جہاں کبھی ہر طرف اردو کے چراغ روشن تھے آج وہاں تاحد نظر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس مسئلے پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کی ضرورت

ہے۔ جناب عابد سہیل کا خاکہ پڑھ کر احمد جمال پاشا کی یادیں تازہ ہوگئیں۔

■ **انوار انصاری، سابق سینئر آڈٹ آفیسر، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چونا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی۔1 (جھارکھنڈ)**

اگست 2005 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا مگر جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی دل سے ایک آہ نکلی اور جب یہ شعر پڑھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دل مزید غمزدہ ہوگیا۔ ہم اچھے دانشوروں، بہترین عالموں اور ماہر سیاست دانوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ذکریا عہد حاضر میں ہندوستانی تہذیب کے علم بردار سیکولر انسان تھے جو ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

اس بار آپ نے عمدہ اور بہترین مضامین شامل کیے ہیں۔ نیر مسعود کا مضمون ''انیس باشندۂ لکھنؤ'' بڑے شوق سے پڑھا اور میر انیس کے متعلق بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ پریم چند کی کہانی ''منتر'' بھی لاجواب ہے۔ غیب الرحمٰن کی نظم ''گھر'' پڑھ کر بے حد متاثر ہوا۔ انھوں نے بالکل درست لکھا ہے کہ

یہ گھر جو بنائے تھے تم نے
تم ان میں اکیلے رہتے ہو
اک روز یہاں مر جاؤ گے
بچے نہ پلٹ کر آئیں گے
اس روز یہ گھر مر جائیں گے

خاکسار بھی اس المیے سے گزر رہا ہے۔ شمیم حنفی سے گفتگو بھی بہت اہم ہے۔ انھوں نے کئی باتیں صاف صاف اور کھری کہی ہیں۔

جون کے شمارے میں آپ نے ''ہماری بات'' کے تحت ڈاکٹر عبدالکلام کی شخصیت کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے وہ سچائی پر مبنی ہے۔ اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسے میزائلوں کے خالق کو معاشی تنگی نے سبزی خور بنا دیا لیکن حالات کی سختی نے ان کے پائے ثبات کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ ''محمد سعد الحسن خاں سے ایک ملاقات'' نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ انھوں نے بہار پبلک سروس کمیشن کے 45ویں مشترکہ امتحان میں ہندی میڈیم سے اول مقام حاصل کیا۔ ان کا کہنا بجا ہے کہ ''ناسازگار حالات اور ابتدائی ناکامیابیوں سے قطعاً پریشان نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ناکامیابیاں ہی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔''

مظہر امام سے گفتگو بھی اہم انٹرویو ہے۔ انھوں نے بھی اپنی محنت کی بدولت ادب میں اپنا نام روشن کیا۔ مخمور سعیدی کا گراں قدر مقالہ ''ذکر ایک ہمدم دیرینہ کا'' راہی شہابی پر پُر اثر مضمون ہے۔ یہ ایک عمدہ خراج عقیدت ہے۔ آمنہ ابوالحسن کی یاد میں ان کے شوہر مصطفیٰ علی اکبر کا مضمون سوگوار کر گیا۔ ابوذر ہاشم، مدن لال کپور، محمد خلیل اور حکیم اشہر قدیر کے مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

''اردو دنیا'' ہر لمحہ مائل بہ پرواز ہے۔

■ **قربان علی، D-II/99، منوا پارٹمنٹ، میورو ہار، فیز-1، دہلی-110091**

میں سرسید احمد خاں کی شہرہ آفاق کتاب ''آثار الصنادید'' جس میں عہد وسطیٰ کی تاریخی عمارتوں سے متعلق تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں، کی تلاش میں قومی اردو کونسل کے دفتر واقع آر۔ کے۔ پورم گیا۔ میں کونسل کی سرگرمیوں اور اردو زبان میں اس کی گراں قدر مطبوعات سے بے حد متاثر ہوا۔ میرا مشورہ ہے کہ ہر اس آدمی کو کونسل کی ویب سائٹ کو دیکھنا چاہیے جو اس خوبصورت زبان سے محبت کرتا ہے۔

■ **عابد انور، رانچی یونیورسٹی، رانچی (جھارکھنڈ)**

''اردو دنیا'' کے معیار میں مسلسل بہتری آرہی ہے۔ جون کا شمارہ بے حد اچھا ہے۔ سب سے پہلے تو سرورق ہی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام کی خودنوشت ''ونگس آف فائر'' کا اردو ترجمہ ''پرواز'' کے نام سے شائع کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان شکریے کی مستحق ہے۔

گوشۂ ادب خاصا معیاری ہے۔ اس میں مظہر امام سے گفتگو اور مخمور سعیدی کا مضمون ''ذکر ایک ہمدم دیرینہ'' کا راہی شہابی کے لیے ایک بہترین خراج عقیدت ہے۔ ابرار رحمانی اور مصطفیٰ علی اکبر کے مضامین بھی عمدہ ہیں۔ اس کے علاوہ ابوذر ہاشم، مدن لال کپور، محمد خلیل، شبیر احمد اور حکیم اشہر قدیر کے عمدہ مضامین کے مطالعے سے ذہن کے دریچے وا ہوگئے اور بہت سی نئی جانکاریاں ملیں۔

بچوں کے گوشے میں بی۔ آر۔ امبیڈکر کی سوانح عمری پڑھ کر امبیڈکر کی عظمت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ دعا ہے ''اردو دنیا'' اسی طرح تابندہ ستارے کی مانند چمکتا رہے۔

■ **قاری ایم۔ ایس۔ خاں، جرنلسٹ، ہاؤس نمبر 720-2-16، نیو ملائی پیٹ، حیدرآباد-36، (اے۔ پی۔)**

محلے کے دارالمطالعہ میں ''اردو دنیا'' پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اگست کا شمارہ اس وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔ بڑا ہی حسین وجمیل ماہنامہ ہے، اللہ اسے نظر بد، قلب حاسد اور ید ظالم سے تا عمر محفوظ رکھے۔ ''بدلتا سماج اور اردو میڈیا کے لیے نئے مبارزات''؛ ''اردو اور ذرائع ابلاغ کا بدلتا منظرنامہ''، ''اداریہ نویسی''، ''مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسیاں اور اردو''، ''ادب اطفال اور ہماری بے حسی''؛ ''پانی کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت'' وغیرہ مضامین مجھے بے حد پسند آئے۔

■ **ڈاکٹر حیات افتخار، نمبر 80#، (اولڈ 213/1#)، چولائی میڈو ہائی روڈ، چولائی میڈو، چینئی-600094**

آپ شمال اور جنوب کا امتیاز کیے بغیر ہر قسم کے مضامین کو اپنے موقر رسالے میں جگہ دیتے ہیں اور کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آپ کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہیں۔

■ **غلام عباس فریدی، عرفان آباد، ڈوڈہ سٹی-182202**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' واقعی اعلیٰ درجے کی صحافت کا مظہر ہے۔ ادبی اور سائنسی مضامین کے علاوہ معلومات عامہ کے اضافے میں بھی کافی مددمعاون ہے۔

■ **محمد خواجہ گیسودراز، نیورحمت نگر کالونی، نزد مسجد معراج، محبوب نگر کالونی، گلبرگہ-5**

میں ''اردو دنیا'' کا پچھلے تین چار سال سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ ''اردو دنیا'' کا جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کے سرورق پر ہندوستان کی مایۂ ناز شخصیت جناب سنیل دت کی تصویر دیکھ کر دل سوگوار ہوگیا۔ ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے فروغ اور ہندو مسلم یکجہتی کے لیے اداریے میں سنیل دت کی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً موصوف کی شخصیت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ''اردو دنیا'' کی باقاعدہ اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **چاند میاں طیب، 105/129، جبلی کالج روڈ، چمن گنج، کانپور**

جولائی کے شمارے میں سنیل دت کے بارے میں اداریہ پڑھ کر دل پر اثر ہوا۔ سرورق پر دت صاحب کی تصویر بھی متاثر کن ہے۔ رسالے میں جو تبصرے شائع ہوتے ہیں ان میں کتاب کا سن اشاعت بھی درج ہونا چاہیے تا کہ معلوم ہو سکے کہ کون سی کتاب کب شائع ہوئی ہے۔

■ **محمد سمیع الدین، 22 سیمرن رائے روڈ، نزدیک گنڈول سنیما، آسنسول، بردوان، مغربی بنگال**

''اردو دنیا'' واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ ہر اردو والے کو اس کا خریدار بن کر اس مشن کو کامیاب بنانے کی ضرورت ہے۔

■ **محمد فیصل عارفی، گلشن عارف، مردہی ٹولہ، سیتا پور، یوپی**

جولائی کا ''اردو دنیا'' باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں ''کیرالا میں اردو''، ''اردو کی بقا کے لیے چند عملی تجاویز''، ''البرٹ آئنسٹائن — دو صدیوں کا نقاش''، ''روبوٹ۔ ایک انسانی متبادل'' اور ''ہندوستان میں اسلام کی آمد'' بہت پسند آئے۔

■ **ڈاکٹر فاروراہی، نزدیک یتیم خانہ، جودھپور (راجستھان)**

''اردو دنیا'' کا جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ اس میں حسب معمول انٹرویو، درس و تدریس کے مسائل، کمپیوٹر کا مختلف شعبوں میں استعمال، صحافت، سائنس اور ادب غرض ہر پیشے اور عمر سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے مواد موجود ہے۔

■ **نعیم رضا، کھرنی پورہ، یاول، ضلع جلگاؤں-425301**

''اردو دنیا'' ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کے مطالعے سے قومی اردو کونسل کی جملہ کاوشوں سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے جو اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کی جا رہی ہیں۔

□□□

دیوانِ اشرف علی خاں فغاں

مرتب: سرورالہدیٰ

اشرف علی خاں فغاں اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا بچپن چونکہ دہلی کے قلعۂ معلیٰ میں گزرا تھا اس لیے ان کی زبان اور محاورے کو استناد کا درجہ حاصل ہے اور ان کے دیوان کا مطالعہ اردو کے محاورے، روزمرہ اور لب و لہجے کو سمجھنے میں معاون ہے۔ فغاں کے اردو اور فارسی کلام کا یہ تحقیقی ایڈیشن سرورالہدیٰ نے مرتب کیا ہے اور فغاں کے حالاتِ زندگی اور ان کے شاعرانہ اوصاف پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

صفحات: 285، قیمت-/123 روپے

سورداس کے روحانی نغمے

ترجمہ و ترتیب: جعفر رضا زیدی

سورداس ہندی کی عارفانہ شاعری کے بنیادگزاروں میں ہیں لیکن ان کے ہاں تغزل کا رنگ اتنا حاوی ہے کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی کا فرق اپنے فاصلے ختم کر دیتا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کے ہجر اور وصل کے مناظر اور کیفیات پیش کرنے میں سورداس اپنا جواب نہیں رکھتے۔ پروفیسر جعفر رضا زیدی (شیلیش زیدی) نے ''سورساگر'' سے ایک سو ایک نمائندہ پدوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ کتاب دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط میں ہے اور ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 263، قیمت-/91 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

ان دنوں امتحان کے خوف سے طالب علموں میں بڑھتے ذہنی تناؤ کو کم کرنے اور آموزشی عمل کو دلچسپ بنانے کے لیے تعلیمی نظام میں تبدیلی لانے کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے طالب علموں میں خودکشی کا رجحان کافی بڑھ گیا ہے۔ تناؤ سے آزاد تعلیمی نظام کے ذریعے حکومت امتحانی طریقے کو ختم کرکے اسے آسان، دلچسپ، مزید افادی اور کارآمد بنانے پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہے۔

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر یش پال کی صدارت میں قومی تعلیمی نصاب کے ڈھانچے پر نظر ثانی کے لیے قائم شدہ کمیٹی نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے موجودہ نظام میں وسیع پیمانے پر تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی طالب علم دسویں کے بورڈ امتحان میں شامل نہیں ہونا چاہتا تو وہ اپنے اسکول میں ہی دسویں کا امتحان دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ آئندہ بھی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کا خواہش مند ہو۔

گذشتہ چھ اور سات ستمبر کو مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) کے جلسے میں ان امور پر تفصیلی بحث ہوئی۔ قومی تعلیمی نصابی ڈھانچے کے مسودے میں دسویں کے بورڈ امتحان کے لازمی ہونے کو ختم کرنے، امتحانی پرچوں کے پرانے طرز کو تبدیل کرنے اور امتحان کے لیے مقررہ تین گھنٹے کے وقت کو بھی ختم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ بچوں پر غیر ضروری دباؤ کم کرنے کے لیے گھر پر پورا کرنے کے لیے دیے جانے والے کام (ہوم ورک) کے طریقے میں بھی تبدیلی لانے کی سفارش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی امتحانی پرچوں کے انتخاب کے طریقے میں تبدیلی کے علاوہ اسکول کے نصاب میں مختلف مضامین مثلاً ماحولیات، صحت، قومی شناخت، اساتذہ کا رول، امن، عدم تشدد، بیرون نصاب معلومات کو بھی طالب علموں کی ذہانت وصلاحیت کے تعین کا پیمانہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم سفارش یہ ہے کہ "پاس" یا "فیل" کی اصطلاح کو ختم کرکے اس کی جگہ "دوبارہ امتحان لازمی" لکھا جائے گا۔

پیش کردہ تجاویز کے مطابق بچوں کو ابتدائی چار سال میں ہی انگریزی کی اتنی تعلیم دے دی جائے گی کہ وہ آنے والے دنوں میں انگریزی میں مہارت حاصل کرسکیں۔ بچوں کو ان کی مادری زبان میں سیکھنے کے مواقع مہیا کرانے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں کو مساوی درجہ دینے کی سفارش بھی شامل ہے۔ قومی تعلیمی نصابی ڈھانچے کے مسودے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سماجی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ طلبہ میں تخلیقی اور تجزیاتی رجحان فروغ پائے اور امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے رٹنے کی بجائے ان میں مضمون سے متعلق بہتر سمجھ پیدا ہو۔ پروفیسر یش پال کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "ہمارا تعلیمی نظام بچوں پر بہت زیادہ بوجھ ڈالنے والا ہے۔ اسکولی بچوں کی خودکشی کے واقعات اس بات کی علامت ہیں کہ وہ شدید دباؤ سے دوچار ہیں اور ہم لوگ اس مسئلے کے حل کے لیے سنجیدہ ہیں۔" مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کی جانب سے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے جو سفارشات پیش کی گئی ہیں، ان میں چند مندرجۂ ذیل ہیں۔

- ☆ امتحانات میں مختصر جواب والے سوال اور معروضی سوال زیادہ دیے جائیں۔
- ☆ مختصر وقت کے امتحانات کا طریقہ اختیار کیا جائے۔
- ☆ طلبہ جب یہ محسوس کریں کہ ان کی تیاری پوری ہوگئی ہے تب ہی ان کا امتحان لیا جائے۔
- ☆ ذہنی تناؤ کے شکار بچوں کو اسکول کی جانب سے مشاورت اور رہنمائی فراہم کی جائے۔
- ☆ ابتدائی درجے کے طلبہ کے لیے ہوم ورک فی ہفتہ دو گھنٹے، درجۂ ششم سے درجۂ ہشتم تک روزانہ ایک گھنٹے اور درجہ نہم و دہم کے طلبہ کے لیے روزانہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

آموزشی عمل کو دلچسپ بنانے کے لیے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ بچے کو اس کے آس پاس کے ماحول کے بارے میں بتایا جائے اور اسے ان تمام چیزوں سے متعلق پوری معلومات فراہم کی جائیں۔ بچوں کو نصاب سے باہر کی چیزیں بھی بتائی اور پڑھائی جائیں مثلاً پانی کا تحفظ، ماحولیات، امن، صحت عامہ جیسے اہم موضوعات سے بھی انھیں واقف کرایا جائے۔

ہمارے ملک میں رائج تعلیمی نظام میں نمایاں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ کمرۂ جماعت ایسا ہونا چاہیے جو درسی کتابوں کی اہمیت کے بارے میں جاننے کی ترغیب و تحریک دے سکے۔ درسی مواد کو رٹنے اور رٹی رٹائی چیزوں کو امتحان میں لکھ کر اچھے نمبر یا گریڈ حاصل کرنے کی بجائے طلبہ کو روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے حقائق سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کی طرف راغب کرنا زیادہ سودمند ہے۔ خشک اور غیر دلچسپ آموزشی اور تدریسی عمل دلچسپ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ بچے پڑھائی کو بوجھ نہ سمجھیں۔

افسوس کہ ہمارے اسکولوں میں ان باتوں پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ بچوں کو ان کے مخصوص ماحول، تہذیب اور حالات کے تناظر میں درسی اطلاعات کی فراہمی پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اس عمل میں تعلیم کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ دیہی علاقے کے طلبہ کو اس صورت حال سے سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے جو شہری طالب علموں کی بہ نسبت بہت ساری معلومات سے محروم رہ جاتے ہیں اور بہتر زندگی گزارنے کے لیے علم کا استعمال کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

قومی تعلیمی نصابی ڈھانچے کا مسودہ تیار کرنے والوں نے تعلیمی نظام کی خامیوں کی نشاندہی بجا طور پر کرلی ہے لیکن اہم مسئلہ ان خامیوں کو دور کرکے نمایاں تبدیلیوں کے لیے سازگار ماحول تیار کرنا ہے۔ چونکہ اساتذہ کو تعلیمی نظام میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لیے ان اصلاحات کا آغاز اساتذہ کی مہارت میں مزید بہتری اور ان کے رویے میں تبدیلی لانے کی کوششوں سے ہونا چاہیے۔ اساتذہ ایسے ہونے چاہئیں جو طالب علموں کو ملک اور معاشرے کے تئیں حساس اور ذمے دار بنا سکیں۔ اگر اساتذۂ کرام اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دیں اور مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کی سفارشات پر سنجیدگی سے عمل درآمد ہو سکے تو نہ صرف بچوں کو امتحان کے خوف اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی تناؤ سے نجات ملے گی بلکہ ان کی تخلیقی اور تجزیاتی صلاحیتوں کو بھی جلا ملے گی اور مستقبل میں وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرسکیں گے۔

ایم.این.شاہنواز

محمد علی اشرف فاطمی سے گفتگو

متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت نے اپنے قیام کے فوراً بعد سے ہی اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کی ہمہ جہت ترقی بالخصوص تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی سنجیدہ کوششیں شروع کی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی ترویج و ترقی پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ ان تمام امور پر جناب محمد علی اشرف فاطمی، مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل سے ایم.این. شاہنواز کی گفتگو قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

سوال: اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے عملی سطح پر آپ کی وزارت کیا کر رہی ہے؟

جواب: ہندوستان میں دو طبقوں کے لوگ سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ ایک درج فہرست ذاتیں اور درج فہرست قبائل اور دوسرے مسلمان۔ دونوں طبقوں کے لیے حکومت نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ عملی سطح پر ان کی فلاح و بہبود کے لیے کئی منصوبے زیر غور ہیں۔ یہاں میں یہ بات خاص طور سے بتانا چاہتا ہوں کہ بچے تعلیمی میدان میں جب ابتدائی اور ثانوی سطح سے ہی آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں تو آگے کی بات کرنا بے سود ہے۔ عام طور پر اسکولوں میں بچوں کا داخلہ ہی بہت کم ہوتا ہے بالخصوص مسلم بچوں کا تو داخلہ اور بھی کم ہوتا ہے اور ہاں داخلے کے بعد درمیان میں ہی ترک تعلیم کی شکایت عام ہے، لڑکیوں میں تو یہ بہت زیادہ ہے۔ ایسے میں حکومت کو بدنام کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ہندوستان کا کوئی ایسا دیہی حلقہ نہیں ہے جہاں ابتدائی اور ثانوی سطح کی تعلیم کے لیے اسکول نہ ہو۔

سوال: سروشکشا ابھیان (سب کے لیے تعلیم کی مہم) اپنے مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ثابت ہو رہا ہے؟

جواب: سروشکشا ابھیان کے نتائج بہت اچھے ہیں۔ دوسرے پی.جی. ایس سینٹر کے اشتراک سے جتنے مدارس اور مکاتب ہیں، انھیں ہم لے رہے ہیں تاکہ کہیں سے یہ شکایت نہ ملے کہ ہمارے درمیان اسکول نہیں ہے۔ مثلاً مدھیہ پردیش میں 300 مدارس اور بہار میں 400 مدارس کو سروشکشا ابھیان سے جوڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں سے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں ہم سروشکشا ابھیان سے جوڑ رہے ہیں۔

سوال: ان دنوں بہار میں شکشا متر کی تقرری کا سلسلہ جاری ہے۔ حکومت کی جانب سے ان شکشا متروں کو کیا کیا سہولتیں فراہم ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ ای.جی.سینٹر کے اشتراک سے جتنے بھی اسکول چل رہے ہیں، ان سبھی اسکولوں میں بچوں کو دن کا کھانا اور کتابیں مفت فراہم کی جا رہی ہیں۔ دوسرے ہر 40 طالب علموں پر ایک استاد کی تقرری کی جا رہی ہے جسے ہم شکشا متر کے طور پر تنخواہ بھی دے رہے ہیں اور دیگر سہولتیں بھی۔ سردست ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں اور بچیوں کو پابندی سے اسکول بھیجیں اور درمیان میں تعلیمی سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیں۔

سوال: بہار میں طالبات کے لیے خاص طور سے ثانوی تعلیم کا فقدان ہے۔ حکومت سے بار ہا شکایت کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: جہاں تک بہار میں ثانوی تعلیم کا تعلق ہے، حکومت اس مسئلے پر بہت سنجیدہ ہے اور ابھی حال ہی میں ہم نے کئی اہم فیصلے لیے ہیں جن کے نتائج بہت جلد سامنے آنے شروع ہو جائیں گے۔ دوسرے ابھی ہم نے پورے ہندوستان میں 750 کستوربا گاندھی آواسیہ ودیالیہ قائم کرائے ہیں۔ دس فیصد ایسے تعلیمی ادارے ان علاقوں میں قائم کیے گئے ہیں جہاں اقلیتی طبقے کی آبادی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ اس حکومت نے فیصلہ کیا کہ کستوربا گاندھی آواسیہ ودیالیہ میں صرف لڑکیاں زیر تعلیم ہوں گی اور کم از کم 75 فیصد سیٹیں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، پسماندہ طبقے اور مسلم لڑکیوں کے لیے مخصوص ہوں گی۔

سوال: کسی بھی کیندریہ ودیالیہ میں اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے، نوودے ودیالیہ کا بھی یہی حال ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: میں ایسا نہیں مانتا کہ کسی بھی اسکول میں اردو تعلیم کا نظم نہیں ہے مثلاً نوودے ودیالیہ کے مقابلہ جاتی امتحان میں اردو داں بچے بیٹھتے ہی نہیں تو ان کا داخلہ کیسے ہوگا اور جب متعلقہ مضامین کے بچے مذکورہ اسکول میں زیر تعلیم نہیں ہوں گے تو اردو تعلیم کا انتظام کس کے لیے کیا جائے گا۔ بہرحال

میں اس سلسلے میں ایک میٹنگ جلد ہی بلا رہا ہوں تا کہ مزید معلومات حاصل کرسکوں کہ نوودے ودیالیہ میں مسلم بچوں کے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟ جہاں تک کیندریہ ودیالیہ کا سوال ہے تو اس میں تو بیشتر سرکاری ملازمین کے بچے ہوتے ہیں اور سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ نتیجے کے طور پر اردو پڑھنے والے طلبہ کیندریہ ودیالیہ میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دوسرے آج کل کے بچے اردو پڑھنا نہیں چاہتے۔ وہ انگریزی اور دیگر مضامین پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں اردو بھی پڑھنی چاہیے اور اس کی سہولیات مہیا کرانے کے لیے حکومت سے مطالبہ بھی کرنا چاہیے۔

سوال: آپ نے بہار کے تمام اضلاع میں کیندریہ ودیالیہ کھولنے کا اعلان کیا ہے، جہاں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھی جاسکے گی لیکن متعلقہ محکمے سے اسے منظوری نہیں مل سکی ہے، ایسے میں کیا بچوں کا مستقبل متاثر نہیں ہوگا؟

جواب: اردو تعلیم کے نفاذ کے تعلق سے کارروائی جاری ہے لہٰذا اردو پڑھنے والے طلبہ کو فکرمند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور بہتر سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں کیونکہ تعلیم ہی ساری کامیابی کی کنجی ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہی ہے کہ بہار کے تمام اضلاع میں ایک کیندریہ ودیالیہ اور ایک نوودے ودیالیہ کی سہولت ہو اور مجھے پوری امید ہے کہ 2005-06 تک ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔

سوال: ابھی حال ہی میں بہار کے سی.بی.ایس.ای. سے دسویں جماعت پاس کئی طلبہ کو دہلی کے مختلف کیندریہ ودیالیوں نے داخلہ دینے سے اس لیے انکار کردیا کہ ان بچوں نے اردو بحیثیت ایک مضمون لے رکھی تھی، کیندریہ ودیالیہ کی اردو مخالف پالیسی میں تبدیلی کے لیے آپ کی وزارت کوئی کارگر اقدام کرے گی؟

جواب: مجھے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ہے لیکن ایسا واقعہ اگر پیش آیا ہے تو وہ بچے مجھ سے ملیں۔ میں دیکھوں گا کہ ان کا داخلہ کیوں نہیں ہوا اور اس سلسلے میں جو بھی رکاوٹ ہوگی، میں اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

سوال: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے متعلق آپ کی وزارت نے کئی اہم فیصلے کیے ہیں مثلاً ہندوستان کے متعدد شہروں میں نئے مراکز مطالعہ (اسٹڈی سینٹر) اور علاقائی مراکز (ریجنل سینٹر) قائم کرائے ہیں لیکن اتنی بڑی آبادی کے پیش نظر کیا یہ مراکز، ناکافی نہیں ہیں؟ اردو کے فروغ کے تعلق سے اس یونیورسٹی کی کارکردگی کس حد تک اطمینان بخش ہے؟

جواب: سردست ہماری وزارت نے پانچ نئے علاقائی مراکز کو منظوری دی ہے، سری نگر، بھوپال، دربھنگہ، ممبئی اور کولکاتا۔ ان کے علاوہ جیسے جیسے ضرورت محسوس ہوگی، نئے علاقائی مراکز قائم کیے جائیں گے اور مراکز مطالعہ بھی ضرورت کے مطابق کھولے جائیں گے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو کے فروغ کے لیے بہت بہتر کام کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی سرپرستی میں یہ یونیورسٹی ہمارے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

سوال: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں تقریباً تمام مضامین کے ساتھ ساتھ پروفیشنل کورس کی تعلیم کا بھی انتظام ہے مگر اردو سے متعلق ایک بھی کورس نہیں ہے۔ کیا آپ کی وزارت اس سلسلے میں کچھ کر رہی ہے؟

جواب: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں اردو تعلیم کا کوئی کورس نہیں ہے۔ واقعی یہ بات افسوسناک ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے اگنو میں اردو سے متعلق کورسوں کی شروعات ہو تاکہ اردو والے بھی اس سے مستفیض ہوسکیں۔

سوال: بہار میں تمام اردو ادارے وسائل کی کمی کے سبب دم توڑ رہے ہیں، اس کے لیے کون ذمے دار ہے؟

جواب: میں ایسا نہیں مانتا کہ بہار میں اردو ادارے دم توڑ رہے ہیں۔ تمام اسکولوں اور مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ دوسرے میں آپ کو یہ بتادوں کہ پہلے 1200 مدارس منظور تھے اور ابھی ہم نے 2700 نئے مدارس کو منظوری دی ہے لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ بہار میں اردو کی صورت حال ابتر ہے۔

سوال: حال ہی میں بی جے پی نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے نویں جماعت میں شامل مواد پر سخت اعتراض کیا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: کسی پارٹی کے اعتراض کرنے یا سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کتابیں لکھتے وقت ذات پات اور مذہب کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ غیر جانبدار ہوکر صحیح تاریخ لکھی جاتی ہے۔ کسی خاص مقصد کے پیش نظر کوئی چیز نہیں لکھی جاتی۔

جواب: قومی اردو کونسل ایک بڑا ادارہ ہے۔ اس کی کارکردگی سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کے حوالے سے قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ قومی اردو کونسل اپنے محدود وسائل کے ساتھ جس وسیع پیمانے پر مختلف شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ ان کاموں کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

□□□

کونسل کی بعض اہم کتابوں پر غیر معمولی رعایت

2005 کا سال اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کا سال ہے۔ بیسویں صدی میں برصغیر کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے کلام کی با قاعدہ اشاعت بھی 1905 سے شمار کی جاتی ہے اور اس سال ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ بھی آیا۔ اردو کے کلاسیکی شعرا میں آخری بڑا نام نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا ہے۔ 2005 میں ان کے انتقال کو بھی سو سال ہو جائیں گے۔ 2005 اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمارے ترقی پسند ادب کے اہم ترین معمار سجاد ظہیر کی پیدائش کو بھی 2005 میں سو سال ہو جائیں گے۔ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار اور مارکسی مفکر ڈاکٹر رشید جہاں کی پیدائش کے بھی سو سال اسی سال مکمل ہوں گے۔

سال 2005 کی مندرجۂ بالا اہمیت کے پیش نظر یہ طے کیا گیا ہے کہ کونسل کی مندرجۂ ذیل اہم مطبوعات کو ہم 75% فیصد رعایت پر شائقین کو فراہم کریں گے یعنی جو کتاب 100 روپے کی ہے وہ 25 روپے میں حاصل ہو سکے گی۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا۔ برائے کرم کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ فرمائیں۔

جو کتابیں کئی جلدوں میں ہیں ان کی کوئی جلد الگ سے فروخت نہ کی جا سکے گی۔ لیکن ہم پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر کلیات پریم چند کی متفرق جلدیں اس موقعے پر بے تکلف مہیا کر سکیں گے۔ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب: کلیم الدین احمد

محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی یہ پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت وبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

قیمت: مکمل سیٹ -/3400 روپے

نور اللغات

مرتب: نور الحسن نیر کاکوروی

یہ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی تالیف کردہ اردو کی مشہور اور مستند لغت ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اہم لغت مدت سے نایاب تھی، اردو کونسل نے عام استفادے کے لیے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/1095 روپے

فرہنگِ آصفیہ

مرتب: سید احمد دہلوی

یہ اردو زبان کا وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھا۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔

قیمت: (مکمل تین جلدیں) 750 روپے

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا

کونسل نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔
مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، سات جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

قیمت: -/1790 روپے

کلیات پریم چند

مرتب: مدن گوپال

اردو فکشن کے بنیاد گزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/4071 روپے

اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب حاصل مطالعہ، کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے — اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

سیر کہسار

پنڈت رتن ناتھ سرشار

اردو کے مایۂ ناز انشا پرداز اور ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول جو مدتوں سے نایاب تھا۔

صفحات: 846، قیمت: -/167 روپے

اصول معاشیات

سید علی

یہ کتاب اعلیٰ ثانوی درجات کے طلبہ کو معاشیات کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

صفحات: 192، قیمت: -/47 روپے

تاریخ ادب اردو

مرتبہ: سیدہ جعفر، گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں اردو ادب کے عہد اولیں کے تمام سرمایہ مواد کا تحقیق شدہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی مختلف تاریخوں میں یہ تاریخ اپنی خصوصیات کے باوصف منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

للو لال جی کوی — ایک ادبی سوانح

ابوسعادت جلیلی

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ قلم کاروں میں للو لال جی اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے جدید ہندی نثر کی بنیاد ڈالی۔ اس کتاب میں ان کے احوال و کوائف کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا بھی مختصر طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 280، قیمت: -/72 روپے

تامل ناڈو میں اردو

علیم صبا نویدی

اس کتاب میں 1824 سے 1986 کے درمیان تامل ناڈو کے اردو شعر و ادب سے متعلق واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے اور تذکرے کے انداز میں تمام شعرا و ادبا کے حالات اور کلام کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 436، قیمت: -/135 روپے

جنت سنگار

ملک خوشنود، مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر

ملک خوشنود کی مثنوی "جنت سنگار" (1645) دکنی ادب کے قدیم شہ پاروں میں سے ہے۔ کونسل نے اسے پروفیسر سیدہ جعفر کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

صفحات: 590، قیمت: -/180 روپے

زراعتی انکشافات

پروفیسر محمد شفیع

اس کتاب میں زراعت سے متعلق مختلف موضوعات مثلاً زراعتی مٹی، کھاد، فصلوں کی عام بیماریوں، فصلوں پر کیڑوں کے حملے اور ان کا انسداد، ریشم اور شہد کی پیداوار، لاکھ اور جل کھمبی (Mushroom) کی کاشت اور مچھلی پالن وغیرہ موضوعات پر آسان زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 260، قیمت: -/192 روپے

غرائب الجمل

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا

نظر ثانی و ترتیب: حسن الدین احمد

اس کتاب میں تاریخ گوئی کے اصولوں اور قاعدوں کو مفصل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تاریخی قطعات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے جو آہستہ آہستہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے جارہے ہیں۔

صفحات: 314، قیمت: -/76 روپے

ہندوستانی مصوری (عہدِ مغلیہ میں)

پرسی براؤن، مترجم: عبدالحق

مغلیہ عہد میں جہاں تمام فنون لطیفہ کو عروج حاصل ہوا وہیں فنِ مصوری میں نہ صرف بڑی ترقی ہوئی بلکہ اس فن کے نئے نئے پہلوؤں کا ارتقا ہوا۔ مغل مصوری صرف تصویر چہ (miniature) سازی نہیں، صرف کتابوں پر نقاشی نہیں، بہت کچھ اور بھی ہے اور یہ مصوری دنیا کے فنون لطیفہ کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ اس کتاب میں مصوری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مصوری کی اقسام، طریقۂ کار، ساز و سامان، اہم مصوروں اور ان کے فنی نمونوں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

صفحات: 256، قیمت: -/158 روپے

بھارت 2001

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: -/250 روپے

فیودر دستوئیفسکی

ظ. انصاری

عظیم روسی ناول نگار فیودر دستوئیفسکی کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دستوئیفسکی کی حیات اور اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف کراتی ہے۔

صفحات: 184، قیمت: -/52 روپے

ہندوستانی مصوری — ایک خاکہ

انیس فاروقی

ہندوستان میں مصوری کی ایک وقیع روایت رہی ہے۔ تین حصوں میں منقسم اس کتاب میں ہندوستانی مصوری کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مشہور مصور اور مصنف ڈاکٹر انیس فاروقی نے آسان زبان میں ایک مشکل موضوع کا تعارف پیش کیا ہے۔

صفحات: 188، قیمت: -/130 روپے

لغات ابجد شماری

سید احمد

اس کتاب کے پہلے حصے میں حساب ابجد کے مطابق حروف تہجی کی ترتیب سے دیے گئے الفاظ کے اعداد درج کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں اعداد کے تحت ترتیب وار الفاظ دیے گئے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے شغف رکھنے والے حضرات کے لیے ایک انمول تحفہ۔

قیمت: مکمل سیٹ (چار جلدیں) -/472 روپے

گلشن بے خار

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مترجم: حمیدہ خاتون

اس مشہور تذکرے میں کلاسیکی اردو شاعروں خاص کر دہلی کے شاعروں کے منتخب اشعار، ان کے مختصر حالات اور کلام پر شیفتہ نے فارسی میں تبصرہ اور تذکرہ تحریر کیا ہے۔ شیفتہ کی تنقیدی رائیں اردو تنقید اور شعر شناسی میں بے حد اہم مانی جاتی ہیں۔ حمیدہ خاتون نے سلیس اردو زبان میں اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

صفحات: 430، قیمت: -/128 روپے

حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات

سید ممتاز مہدی

حیدرآباد اردو ادب وصحافت کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کی ادبی خدمات کے ساتھ وہاں کی صحافتی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 428، قیمت: -/92 روپے

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتبین (جلد اول تا سوم): گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی

مرتب: (جلد چہارم تا بائیس): مظفر حنفی

وضاحتی کتابیات میں بیسویں صدی کے ربع آخر میں شائع ہونے والی تقریباً تمام اردو کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر کتاب کا مختصر تعارف، مصنف، ناشر، سائز، صفحات اور قیمت وغیرہ بھی دی گئی ہے۔

قیمت (اکیس جلدیں): -/2489 روپے

مسدود راہیں

ترجمہ اور تعارف: زاہدہ زیدی

یہ کتاب دنیا کے عظیم ترین جدید ڈراما نگاروں یوجن لونیسکو (Eugene Lonesco)، میگوئل دی پیرانڈیلو (Miguel de Pirandello)، ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre)، سیمول بیکٹ (Samuel Beckett) کے منتخب ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ہر ڈرامے سے قبل زاہدہ زیدی نے ڈراما اور ڈراما نگار کا جامع تعارف تحریر کیا ہے۔ سب تراجم براہ راست اصل زبان سے کیے گئے ہیں۔

صفحات: 406، قیمت: -/128 روپے

انتظامی قانون کے اصول

ایم. پی جین، ایس. پی. جین، مترجم: احمد مرزا

ہندوستان میں انتظامی قانون کے اصول اور مبادیات سے یہ کتاب تفصیلی طور پر متعارف کرتی ہے۔ انتظامی قانون ایک جدید صنف قانون ہے اور اس کے مسائل ونظریات ابھی عالم ارتقا میں ہیں۔ یہ کتاب تمام مسائل کا عمدہ بیان پیش کرتی ہے۔

صفحات: 612، قیمت: -/120 روپئے

ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا

ایچ. این. سنہا، مترجم: محمد سلیم قدوائی

اس کتاب میں ہندوستانی تاریخ کی ابتدا سے عصر حاضر تک کے سیاسی اداروں، نظریوں اور روایتوں کا تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/95 روپئے

وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی

کے. اے. نیلکنٹھ شاستری

اس کتاب میں سلطنت وجے نگر کی تین صدیوں (1336-1650) پر مشتمل سیاسی، سماجی، معاشی وتمدنی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 569، قیمت: -/118 روپئے

چولا راجگان

کے. اے. نیل کنٹھ شاستری، مترجم: ریدمن سیٹھی

اس کتاب میں تمام دستیاب مآخذ کے حوالے سے جنوبی ہند کی چولا سلطنت (850 تا 1216) کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور چولوں کے نظام حکومت، مالیاتی نظام، اس عہد کے معیار زندگی، زراعت اور زمین کے حقوق، صنعت و تجارت، سکے اور ناپ تول کے پیمانے، تعلیم، ادب، آرٹ وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 1115، قیمت: -/209

عشری درجہ بندی

میلول ڈیوی، مترجم: سید محمود حسن قیصر امروہوی

عصر حاضر میں کتابوں کی درجہ بندی کے لیے زیادہ تر کتب خانے ڈیوی کے وضع کردہ عشری درجہ بندی (Dewey Decimal Classification) کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کتاب میں اس درجہ بندی سے متعلق تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

صفحات: 908، قیمت: -/167 روپئے

علی وردی اور اس کا عہد

کالی کنکر دتا، مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں جو بہت ساری خود مختار سلطنتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں ان میں حکومت بنگال بھی تھی جس کا حکمراں علی وردی خاں تھا۔ علی وردی خاں نے بڑی حد تک ایک مثالی حکومت قائم کی اور اس کے زمانے میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں بہت خوشحالی رہی۔ اس کتاب میں علی وردی خاں کے عہد حکومت (اپریل 1740 تا اپریل 1756) کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 392، قیمت: -/86 روپئے

قدیم ہندوستان میں شودر

رام شرن شرما، مترجم: جمال محمد صدیقی

شودر زمانہ قدیم سے ہی ظلم واستحصال کا شکار رہے ہیں۔ ممتاز مورخ ڈاکٹر رام شرن شرما نے 1000 قبل مسیح سے 500 تک تاریخی تناظر میں ہندوستان میں شودروں کی حالت کا جائزہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 356، قیمت: -/82 روپئے

ہندوستان کا نظامِ جمال

بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک

(تین جلدوں میں)

مصنف: شکیل الرحمٰن

ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کے پس منظر میں ہندوستانی فنون لطیفہ کا مطالعہ۔ رنگین تصاویر سے مزین ان جلدوں کی طباعت آرٹ پیپر پر کی گئی ہے۔

کل صفحات: 918، قیمت (مکمل سیٹ): -/1311 روپئے

بھارت 2002

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: -/250 روپئے

تحریر: محمود فاروقی
ترجمہ: ابوشہیم خاں

اردو کا نیا مرکز — جنوبی ہند

27/جون 2005 کے "ٹائمز آف انڈیا" کی ایک رپورٹ میں اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیمی صورت حال اور اردو زبان کی روز افزوں ترقی کا بھی مختصر مگر جامع ذکر شامل تھا۔ رپورٹ کے مطابق راجدھانی کے اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات کی کارکردگی دسویں اور بارھویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات میں بہت خراب تھی یہاں تک کہ اچھے اور معیاری اسکولوں میں بھی کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد محض 50 فیصد رہی۔

اردو کے حوالے سے دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ یہ زبان اپنی جائے پیدائش (شمالی ہند) میں تو زوال پذیر ہے لیکن اس کے برعکس جنوبی ہند کی اکثر ریاستوں میں اسے عروج حاصل ہے۔

ہندوستان میں اردو کی صورت حال مستقل تشویش کا باعث رہی ہے۔ گذشتہ ساٹھ برسوں میں ہر حکومت نے اردو زبان کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے کسی پالیسی اسکیم، باڈی یا بورڈ کی تشکیل کی۔ یوپی اور بہار کی ریاستیں اس طرح کی پیش قدمیوں کا مرکز رہی ہیں چونکہ ان ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے۔ اسی بنیاد پر تصور کیا گیا کہ اس زبان کے زیادہ تر بولنے والے بھی یہیں ہیں۔ بظاہر یہ خیال درست تھا لیکن اردد اور اردو بولنے والوں پر ہندی کے مسحور کن اثر کو نظر انداز کیا گیا۔ ہندی سے جلدی اور آسانی سے واقفیت اور عوامی ذرائع ترسیل پر اس زبان کے غلبے نے دیگر ریاستوں کے مقابلے میں متذکرہ ریاستوں کے اردو بولنے والوں کو ہندی کی جانب متوجہ کرنے اور اس کو ان کے درمیان مقبول بنانے میں تعاون کیا۔ آج اردو بظاہر مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ یوپی اور بہار میں اس کا تعلق عموماً مدارس اور غیر روایتی نظام تعلیم سے ہے۔ یوپی میں ڈیڑھ کروڑ سے زائد اردو بولنے والے موجود ہیں اس کے باوجود اردو میڈیم ہائی اسکولوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے، اس کے برعکس 2000 سے زائد کرناٹک اور مہاراشٹر میں، 70 دہلی اور 5000 سے زائد اردو میڈیم ہائی اسکول ریاست بہار میں موجود ہیں۔ ہر سال اردو میڈیم کے پانچ لاکھ سے زائد طلبہ دسویں اور بارھویں جماعتوں کے بورڈ کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ محض 30 فیصد ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ مزید برآں یوپی اور بہار میں تو یہ فیصد محض 25 ہے جبکہ مہاراشٹر اور دوسری جنوبی ریاستوں میں یہ فیصد 70 اور 80 تک ہے۔ بہار کے علاوہ مہاراشٹر میں اردو میڈیم کے طلبہ کا دوسری علاقائی زبانوں کے طلبہ سے برابر کا مقابلہ رہتا ہے اور کبھی کبھار تو یہ طلبہ بورڈ کے امتحانات میں امتیازی حیثیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

موجودہ بجٹ میں بھی مرکزی حکومت نے اردو اساتذہ کے لیے فنڈ مختص کیا ہے جس کے تحت ریاستی حکومتوں کے ماتحت اسکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کی جاسکتی ہے جن کے کچھ اخراجات مذکورہ فنڈ کے تحت مرکزی حکومت اٹھائے گی۔

ہندی اور انگریزی کی طرح اردو زبان کے بولنے والے بھی مختلف ریاستوں میں موجود ہیں۔ لیکن ہندی کے برخلاف یہ کسی بھی ریاست کی پہلی زبان نہیں ہے اور یہ عالمی رابطے کی یا پھر سرکاری زبان بھی نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بولے جانے کی سطح پر اردو پانچ ریاستوں آندھرا پردیش، بہار، مہاراشٹر، کرناٹک اور یوپی کی دوسری زبان ہے۔ گنگا کے آس پاس کی ریاستوں کے مقابلے میں ساحلی علاقوں میں اردو کی حالت بہتر ہے۔

چونکہ اردو ان ریاستوں کی زبانوں سے مماثلت نہیں رکھتی اس لیے وہاں اسے فروغ کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

جہاں تک اردو اخبارات و جرائد کا تعلق ہے۔ 2000 سے زائد اشاعتوں کے ساتھ ہندی اور انگریزی کے بعد یہ تیسرے نمبر پر ہے۔ 1991 میں 2000 سے زائد اردو روزنامے تھے لیکن ان کی کل تعداد اشاعت محض 25 لاکھ تھی۔ یوپی کے بعد دوسرے نمبر پر آندھرا پردیش ہے۔ آج پورے ملک میں اردو کا کوئی جریدہ یا اخبار ایسا نہیں ہے جو معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ معروف بھی ہو۔ کسی بھی اخبار کی اشاعت بمشکل 25 ہزار سے تجاوز کرتی ہے۔ اردو زبان کبھی دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان سمجھی جاتی تھی جسے پانچ کروڑ ہندوستانی بولتے تھے۔

اردو زبان میں آج شعری مواد وافر مقدار میں موجود ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار سے زائد شعری مجموعے ہر سال شائع ہوتے ہیں۔

18ویں صدی میں جب جدید اردو ادب کے خدوخال اور ضوابط طے پارہے تھے تو اہل دہلی کی جانب سے دکن کی ادبی خدمات کو خاص اہمیت نہیں دی گئی اور نصرتی، قلی قطب شاہ، گیسو دراز اور وجہی جیسی ادبی شخصیات کی تخلیقات کو شمالی ہند اور دہلوی لہجے میں غیر معیاری تصور کیا گیا۔ ملک میں زبان کی موجودہ صورت حال، شمالی ہند میں اس کی بدتر حالت اور جنوبی ہند میں اردو زبان کی حیات نو کو دکن کی جانب سے شمال کی جانب سے تھوپی اور اوڑھی گئی برتری کا دیرینہ ردعمل کہا جاسکتا ہے۔

(بہ شکریہ "ٹائمز آف انڈیا" نئی دہلی، 29/جون 2006)

□□□

پرویز شہریار

فاصلاتی نظام تعلیم اور اردو زبان

ہندوستان میں ''صدفی صد تعلیم'' اور ''سب کے لیے تعلیم'' کے ایجنڈے کو ملک گیر پیمانے پر نافذ کرنا سب سے دشوار کن مرحلہ رہا ہے کیوں کہ یہاں انتہائی کثیر آبادی ہے اور جغرافیائی حالات بھی صد فیصد خواندگی کی راہ میں حائل ہیں۔ ہندوستان میں استاد مرکوز اور رسمی تعلیم کو ملک کے دور دراز کے گاؤں اور دیہاتی علاقوں، پہاڑی اور جنگلی خطوں تک پہنچانا بے حد مشکل امر ہے۔ ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی 65.38 فی صد ہو اور اوسط عالمی معیار کے برعکس استاد اور شاگرد کا تناسب 1:38 ہو ہمارے پاس متبادل نظام تعلیم کی تلاش وجستجو کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمارے یہاں زمانہ قدیم سے مٹھ اور ودیا پیٹھ کا تصور موجود ہے۔ قدیم ہندوستان میں نالندہ اور تکشیلا جیسی عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹیاں موجود تھیں جن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ ایشیا کے دور دراز ممالک سے آیا کرتے تھے اور وہاں قیام کرکے رائج الوقت تعلیم سے مستفید ہوتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مدرسہ اور مکتب تعلیم کی بنیادی ضرورت کو پورا کرتے آئے ہیں۔ لیکن آج جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں پرانے نظام تعلیم کی معنویت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم نسبتاً زیادہ مسابقتی ہے اور امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے کے باوجود پسندیدہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ نہیں مل پاتا ہے۔ ایسی صورت میں طلبہ فاصلاتی نظام تعلیم کی طرف متوجہ ہورہے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کو فوقیت دے رہے ہیں۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت ایک مساوی نصاب کے ذریعے طلبہ کو خود آموزی مواد فراہم کرایا جاتا ہے۔ جہاں طلبہ اپنی سہولت کے مطابق مطالعہ کرتے ہیں اور معینہ مدت کے بعد امتحان دے کر سند حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تاحیات تعلیمی سلسلے کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور چند دیگر ریاستی تعلیمی اداروں کے ذریعے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سرکاری طور پر تعلیم کی ترویج و اشاعت کے اہم کام انجام دیے جارہے ہیں۔ سرکاری سیکٹر کے شانہ بشانہ نجی سیکٹر میں بھی تعلیم پر سرمایہ کاری کی جارہی ہے اور اسے گھر گھر پہنچانے کے لیے آڈیو کیسیٹ، ویڈیو کیسیٹ اور سی ڈی روم کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

لیکن ناقص قسم کے مواد کی تحسیب کاری اور معیار بندی ضروری ہے۔ کئی اوپن یونیورسٹیوں میں فاصلاتی تعلیم اور مراسلاتی تعلیم کے شعبوں میں نصاب بہت آسان کردیا گیا ہے جب کہ رسمی تعلیم نظام کی یونیورسٹیوں میں معیار تعلیم اعلیٰ ہوتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم سے حاصل کی جانے والی سندوں کی اہمیت تعلیم، ملازمت اور دیگر امور کے لیے تب ہی قابل قبول ہوسکتی ہے جب اس کا معیار بہتر بنائے رکھا جائے۔

ہندوستان میں بھی پہلی بار 1982 میں امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدر آباد میں فاصلاتی نظام تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد 1985 میں قومی سطح پر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کا قیام عمل میں آنے کے ساتھ ہی فاصلاتی نظام تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا اور اب تک 10 اوپن یونیورسٹیاں اور 62 یونیورسٹیوں کے شعبے اس سلسلے میں سرگرم عمل ہیں۔ اس وقت IGNOU کا شمار دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں 900 کورسوں میں تقریباً تیس لاکھ طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس کے باوجود یہاں کبھی کسی امتحان کا پروگرام ملتوی نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی کسی رزلٹ میں تاخیر ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بیشتر کام الیکٹرانک مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن کے ذریعے انجام دیے جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ملک کے سبھی 96 مراکز میں ای۔ میڈیا کے ذریعے ٹیلی کانفرنسنگ کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

حکومت ہند نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول اور ریاستی حکومتوں نے بھی اسکول کی تعلیم کے لیے فاصلاتی تعلیم کے ادارے قائم کیے ہیں جو بحسن وخوبی اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کوٹھاری کمیشن برائے تعلیم 1964-1966 کی رپورٹ میں سب سے پہلے فاصلاتی نظام تعلیم کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد نئی تعلیمی پالیسی 1986 کی رپورٹ نے بھی یونیورسٹی کی سطح پر مراسلاتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کی بڑے پیمانے پر ترویج و اشاعت کی سفارش کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جز وقتی اور مراسلاتی تعلیم کو وہی درجہ دیا جائے جو کل وقتی تعلیم کو حاصل ہے۔

انڈیا بورڈ آف مینجمنٹ اور فاصلاتی ایجوکیشن کونسل اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی یہ ذمے داری ہونی چاہیے کہ فاصلاتی تعلیم کی راہ ہموار کریں اور جو یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیمی معیار کو نہیں اپنا رہی ہیں ان کے خلاف کارروائی کریں۔

کئی ایسی بھی یونیورسٹیاں ہیں جو معیاری خدمات انجام نہیں دے رہی ہیں اور فیس کے نام پر طلبہ سے بہت زیادہ رقم وصول کرکے مالی منفعت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ایسی یونیورسٹیاں طلبہ کی کثیر تعداد کو داخلہ دے رہی ہیں اور اپنی دسترس سے باہر مطالعے کے مراکز چلا رہی ہیں۔ ایسی یونیورسٹیوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی ہونی چاہیے تاکہ فاصلاتی تعلیم کا مقصد فوت ہوکر نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ، مطالعے کے لیے ارسال کیے جانے والے مطبوعہ مواد کا معیار بہتر اور ان کی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہونے چاہئیں۔ آڈیو، ویڈیو کیسیٹ اور سی ڈی روم کی قیمت کفایتی اور افادی (Cost effective) ہونی چاہئیں۔ مواد کی فراہمی میں وقت کی پابندی کا پورا پورا خیال رکھا جانا چاہیے۔ تعلیمی مواد کی پیش کش کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیا جائے کہ وہ طلبہ کے لیے موثر ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں دلچسپی بھی پیدا کریں۔ فاصلاتی نظام تعلیم سے اساتذہ اور طلبہ کے درمیان جو خلیج پیدا ہو رہی ہے اسے پاٹنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

مدارس سے فارغ طلبہ سنٹرل یونیورسٹیوں میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں اور ابلاغیات کے اداروں میں اپنے منصب سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ مدرسے سے فارغ طلبہ سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحانات پاس کرکے آئی اے ایس آفیسر بھی بن رہے ہیں اور ایم بی بی ایس جیسی ڈگریاں حاصل کرکے ڈاکٹر بھی بن رہے ہیں اور کمپیوٹر پروگرامر بھی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدرسوں کو فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے ملک کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی ماحول سے وابستہ کیا جائے اور بلاشبہ اردو زبان اس کام کے لیے بہترین وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے، بشرطیکہ جدید ٹیکنالوجی سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔

اردو، بحیثیت زبان اور بحیثیت میڈیم دونوں اعتبار سے فاصلاتی نظام تعلیم سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ملک میں کئی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں ڈگری سطح تک اردو میڈیم کی سہولت فراہم ہے۔ اس کے علاوہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کی ڈگری بھی اردو میڈیم کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اردو میڈیم کے ذریعے بی۔ ایڈ کی دو سالہ ڈگری حاصل کی جاسکتی ہے لیکن یہ سہولت محض ملازمین تک محدود ہے۔

جہاں تک اردو بحیثیت زبان کا تعلق ہے۔ اس میں فاصلاتی نظام کے تحت ماسٹر ڈگری کی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کی ڈگری فاصلاتی نظام کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جس کا قیام جنوری 1998 میں عمل میں آیا، بہت اہم کام انجام دے رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے مقاصد میں اردو زبان کا فروغ، اردو ذریعۂ تعلیم کے توسط سے اعلیٰ یافنی اور پیشہ ورانہ تعلیم فراہم کرنا اور تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ مرکوز کرنا شامل ہے۔ اس وقت یہاں 84 مراکزِ مطالعہ پر ستائیس ہزار طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسے UGC-Infonet کی سہولیت کے ساتھ ساتھ INFLIBNET کنسورشیم کی رکنیت حاصل ہے جس کی وجہ ای جرنلس اور نصابی اور حوالہ جاتی کتابوں تک اسے عالمی ڈاٹابیس جیسی سہولیات کی رسائی حاصل ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی نظامتِ فاصلاتی تعلیم میں جن کورسیز کے لیے تعلیم کی سہولیات حاصل ہیں ان کی مدت قوسین میں دی گئی ہیں:

ایم اے اردو، ایم اے تاریخ (دو سالہ ڈگری کورسیز)، بی۔ ایڈ (دو سالہ ڈگری کورس)، بی اے، بی ایس سی، بی کام (تین سالہ ڈگری کورسیز)، ٹیچ انگلش (ایک سالہ ڈپلومہ کورس)، غذا اور تغذیہ، اہلیت اردو بذریعہ ہندی اہلیت اردو بذریعہ انگریزی فنکشنل انگلش، کمپیوٹنگ (ششماہی سرٹیفکیٹ کورسیز)۔

یونیورسٹی کو چاہیے کہ ''تعلیم بالغان'' اور تعلیم تارکین (Drop outs) پر بھی توجہ دے کیونکہ اردو میڈیم اسکولوں میں تارکین تعلیم کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ نصابی کتابوں کی عدم دستیابی، اساتذہ کا معقول طور پر تربیت یافتہ نہ ہونا، ٹیوشن پر زیادہ توجہ دینا وغیرہ۔ لیکن آٹھویں سے بارھویں جماعت کے طلبہ میں حیاتیاتی تغیر اور نفسیاتی الجھنیں بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے۔ نوجوان پیسے کمانا چاہتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اگر ٹیکنیکل اور ووکیشنل کورسیز شروع کردیے جائیں اور انھیں ان کے اپنے ماحول میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات فراہم کرائی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ Drop outs کی تعداد میں اضافے کو روکا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی انتہائی مؤثر اقدامات کرسکتی ہے۔

حالانکہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکول (NIOP) تارکینِ تعلیم کی از سرِ نو تعلیمی سلسلے کو جاری کرانے میں ایک عرصے سے سرگرم عمل ہے اور یہاں سے تیسری، پانچویں، آٹھویں، دسویں جماعت کے امتحانات براہِ راست دیے جاسکتے ہیں۔ طلبہ اپنی تعلیمی لیاقت کی بنیاد پر مذکورہ کسی بھی جماعت میں داخلہ لے کر امتحان پاس کرکے سند حاصل کرسکتے ہیں لیکن بارھویں جماعت میں داخلے کے لیے دسویں جماعت پاس ہونا اس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے لازمی شرط ہے۔ اسکول کا یہ اوپن نظام تعلیم اس عمر کے بچوں کو ترک تعلیم سے

روکنے اور تعلیم کی طرف راغب کرانے میں کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے اردو زبان میں تدریس و تعلم کے امکانات میں خاطر خواہ اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت فروغ انسانی وسائل (حکومت ہند) فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت اردو کے ترقیاتی پروگرام چلاسکتی ہے اور اپنے وسائل کو بروئے کار لاکر جدید ترین ٹیکنالوجی سے پورا استفادہ کرسکتی ہے اور ایسے کمرشیل اور پروفیشنل کورسیز سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور پی جی ڈپلوما کی فاصلاتی تعلیم کا انتظام شروع کرسکتی ہے، جس سے اردو تعلیم یافتہ بے روزگار طلبہ اور اردو میڈیم کے تارک کتب طلبہ تحصیل اسناد کے بعد روزگار حاصل کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہوٹل مینجمنٹ کا ڈپلوما، ریڈی میڈ کپڑوں کی تیاری کا سرٹیفکیٹ، زری اور دستکاری کا سرٹیفکیٹ، ہومیو پیتھک، یونانی اور آیورویدک ادویات کا ڈپلوما، ہاؤس وائرنگ کا سرٹیفکیٹ، کارپنٹری کا سرٹیفکیٹ، پلمبرنگ کا سرٹیفکیٹ، مٹی کے برتن بنانے کا ڈپلوما، راج مستری اور موٹر مستری کا ڈپلوما اس میں مطبوعہ تعلیمی مواد کے علاوہ آڈیو اور ویڈیو کیسیٹ بھی فراہم کرائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے اردو ترجمے کا پی جی ڈپلوما، ماس میڈیا کا پی جی ڈپلوما، فن خطاطی کا سرٹیفکیٹ، فن طباعت کا ڈپلوما، کتابوں کی جلد سازی کا ڈپلوما جیسے کورسوں کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ یہ کام ریاستی انجمنیں، غیر سرکاری ادارے اور سماجی فلاحی ادارے، اقلیتی ٹرسٹ وغیرہ بھی کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ادارے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت اردو زبان کے ذریعے بے روزگاروں میں ان کورسوں کے توسط سے خود اعتمادی پیدا کرسکتے ہیں تاکہ وہ بیرون ممالک تلاش معاش میں جائیں تو کم از کم انھیں ہنرمند کامگاروں کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ اس طرح اردو کے توسط سے تعلیم یافتہ بے روزگار طلبہ اور افراد روزگار حاصل کرسکیں گے۔[1]

قومی اردو کونسل کی جانب سے مندرجۂ ذیل کورس چلائے جارہے ہیں۔

1. ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ (ایک سالہ کورس)۔
2. اردو ڈپلوما کورس (ایک سالہ کورس)۔
3. فنکشنل عربی میں دو سالہ ڈپلوما کورس۔ (ادارہ)

Publication Deptt. NCERT,
New Delhi-110016

□□□

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے ۱۹۴۷ تک)

مصنف: حنیف کیفی

مشرق اور مغرب کی تہذیبی آویزش سے اردو شاعری نے جو اثرات قبول کیے ان میں نظم معرا اور آزاد نظم کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے اردو شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ حنیف کیفی کی یہ کتاب ان تجربات کی مربوط تاریخ بھی ہے اور ان کا علمی تجزیہ بھی۔ مصنف کے پیش کردہ حقائق کئی مفروضوں کو رد کرتے اور اردو نظم کی روایت کو سمجھنے کے لیے کچھ نئی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

انتخاب کلام حسرت

مرتب: فضل امام

بیسویں صدی میں اردو غزل کے احیا میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا ان میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کو امام المتغزلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں حسرت کے غزلیہ کلام کا ایک جامع انتخاب پیش کیا گیا ہے اور شروع میں ان کے شاعرانہ امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 91، قیمت: -/9 روپے

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)

مصنف: محمد یعقوب عامر

ادبی معرکوں کا ذکر دنیا کی اکثر زبانوں میں ملتا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ یہ معرکے جہاں جذبۂ مسابقت کو مہمیز کرتے تھے وہیں ان کے نتیجے میں ایک خاص قسم کا ادب وجود میں آیا جو مصنف کی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے اور جس کا تجزیہ اس کی زندگی اور اس کے کردار کے بہت سے نامعلوم گوشوں کو سامنے لاتا ہے جس سے فنکار کے فن کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں۔ محمد یعقوب عامر نے اس کتاب میں ابتدا سے عہد مرزا و میر تک کے ان ادبی معرکوں کا احاطہ کیا ہے جو اردو کی ادبی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

صفحات: 251، قیمت -/22 روپے

کرڑی کہانی

راجا کمّی (ایک جاتک کہانی)، لالو بندر ہتھو مگرمچھ (پنچ تنتر کہانی) رنگیلا گیدڑ (پنچ تنتر کہانی)، بے سُرا ڈھونڈو (پنچ تنتر کہانی)

ان دل چسپ اور سبق آموز قدیم کہانیوں کو عہد حاضر کے مشہور مصنف اور ظلم (ائر کنز گڑ ار) نے ان کتابوں میں ایک نئے انداز سے ہندوستان کی موجودہ بول چال کی زبان میں دہرایا ہے جس میں اردو، ہندی اور انگریزی الفاظ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ کتابیں بہ طور خاص اردو کونسل کے یک سالہ "ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج" کے لیے مفید ثابت ہورہی ہیں۔ کتابوں کے ساتھ ان کے کیسٹ بھی تیار کیے گئے ہیں تاکہ الفاظ کا رائج تلفظ بھی ذہن نشیں کرایا جاسکے۔

قیمت: (پورا سیٹ مع کیسٹ) -/280 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سہیل انجم

اردو صحافت کے مسائل

صحافت بھی زبان سے وابستہ ہوتی ہے بہ الفاظ دیگر اگر زبان ارتقا پذیر ہو تو صحافت بھی ارتقا پذیر ہوگی اور اگر زبان روبہ زوال ہے تو صحافت بھی روبہ زوال ہوگی۔ جب اردو زبان پڑھنے والے ہی نہیں ہوں گے تو اردو اخبارات کو کون خریدے گا اور کون پڑھے گا۔ یوں بھی ہم اردو والے انگریزی اخبارات کا مطالعہ اپنی شان سمجھتے ہیں۔ کم از کم دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں کام کرنے والوں اور آزاد صحافیوں کی جو نئی کھیپ ہے وہ اردو زبان کی باریکیوں سے نابلد ہے اور عربی و فارسی زبان کی شد بد تو بالکل بھی نہیں، اور جو صحافی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں ان میں اکثریت انگریزی زبان کی باریکیوں سے ناواقف ہے۔ نتیجتاً بیشتر اخبارات کی زبان غیر معیاری ہوگئی ہے۔

اردو اخبارات کو درپیش مسائل میں دوسرا بڑا مسئلہ سرمائے کا ہے اور اس کا تعلق بھی زبان سے ہے۔ آج کوئی بھی بڑا صنعتی گھرانہ (ایک کو چھوڑ کر) اردو اخبار نکالنے میں دلچسپی نہیں رکھتا اور نہ ہی اردو زبان سے واقف امرا اور سرمایہ دار اردو صحافت میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جب ان اخبارات کے پڑھنے والے ہی نہیں ہیں اور ان کو کچھ منافع ملنے والا ہی نہیں ہے تو پھر وہ پیسہ کیوں لگائیں۔ اردو اخبارات کے قاری نچلے اور متوسط طبقے کے ہیں لہٰذا اعلیٰ طبقہ اس طرف توجہ نہیں دیتا۔ چونکہ پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے اس لیے اشتہارات کی ایجنسیاں بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتیں۔ نجی اشتہار دہندگان بھی اردو اخبارات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ پچھلے دنوں ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ پراپرٹی کا کام کرنے والی ایک نجی کمپنی نے اپنا اردو کا اشتہار "ہندوستان ٹائمس" میں چھپوایا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کمپنی کے مالک نے بتایا کہ ان کا ہدف مسلمان تھے مگر چونکہ وہ اردو اخبارات نہیں پڑھتے لہٰذا انھیں مجبور ہو کر انگریزی اخبار میں اردو کا اشتہار دینا پڑا۔ اس کا فائدہ اس کمپنی کو یوں ہوا کہ وہ اشتہار قارئین کو نمایاں طور پر نظر آیا اور جس طبقے کو اشتہار میں نشانہ بنایا گیا تھا اس نے بھی مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ گویا اردو اخبارات تجارت کے نقطۂ نظر سے بھی کم مفید ہیں ایسے میں ان کو اشتہارات کون دے گا۔ سرکاری پالیسی اور سرکاری کوٹے کے تحت ان کو جو اشتہارات ملتے ہیں ان میں اردو اخبارات کی اپنی تاجرانہ صلاحیتوں کا کچھ زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا۔

جدید ترین ٹکنالوجی سے استفادے کا معاملہ بھی اردو اخبارات کے مسائل میں سے ایک ہے۔ یوں تو ایسے کئی اخبارات مل جائیں گے جہاں انٹرنیٹ وغیرہ لگے ہوں مگر کیا وہ اس سے بھی بھرپور استفادہ کرپاتے ہیں؟ میرا اپنا خیال ہے کہ شاید نہیں۔ ویسے بھی اردو کے بڑے اخبارات کم ہیں، چھوٹے زیادہ ہیں اور وہ جدید ترین ٹیکنالوجی سے متعلق اخبارات اگر آپ انٹرنیٹ پر دیکھ رہے ہیں اور کوئی مضمون آپ ڈاؤن لوڈ کرنا چاہتے ہیں تو بہت آسانی سے کرسکتے ہیں لیکن اردو اخبارات سے ڈاؤن لوڈ کرنے میں اتنی آسانی نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس وہی پروگرام نہیں ہے جو اس اخبار میں ہے تو آپ کے لیے دشواری ہوگی۔ بالخصوص نستعلیق تحریر کو پرنٹ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ گرافکس میں بدل جاتی ہے۔ گویا اردو سے متعلق ٹیکنالوجی کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت کئی ملکوں میں اردو کی ویب سائٹس موجود ہیں۔ ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لیے بھی تربیت یافتہ کارکنوں کی ضرورت ہوگی۔ جدید ٹیکنالوجی سے محرومی کا ایک سبب معلومات سے ناواقفیت بھی ہے۔

اردو اخبارات میں اسٹاف کی بھی کمی ہے اور مالک و مدیر حسب ضرورت اسٹاف نہیں رکھتے یا رکھتے بھی ہیں تو ان کو معقول معاوضہ نہیں دے پاتے۔ ابھی گذشتہ دنوں دہلی کے دو سینما ہالوں میں بم دھماکے ہوئے۔ روزنامہ "قومی آواز" کے ایک رپورٹر نے فائر آفس فون کرکے معلومات حاصل کرنی چاہیں تو فائر آفیسر نے جواب دیا کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو، جائے واردات پر جایئے۔ کیا آپ کے پاس رپورٹر نہیں ہیں؟

آنجہانی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے خبر رساں ایجنسی یو.این.آئی. کے اردو یونٹ کا خواب دیکھا تھا اور دوسرے سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے اس خواب کو عملی جامہ پہنایا جس کے نتیجے میں آج ملک بھر کے کم و بیش پچاس اردو اخبارات یو.این.آئی اردو سروس سے استفادہ کررہے ہیں۔ حکومت نے یو.این.آئی. اردو کی مشین لگانے کے لیے قومی اردو کونسل کے ذریعے سبسڈی دی ہے۔ اس کا صرف نصف چارج اردو اخبارات کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود متعدد اردو اخبارات نصف معاوضہ بھی ادا نہیں کرپاتے۔ جبکہ اس

سروس کا سب سے زیادہ فائدہ چھوٹے اخبارات ہی اٹھاتے ہیں۔ یو.این.آئی. نے اردو اخبارات کو بڑی حد تک سنبھال رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزی کی مشینیں بھی لگائی جائیں اور ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ باصلاحیت مترجمین رکھے جائیں اور ان کو تربیت بھی دی جائے۔

اردو صحافت کا ایک مسئلہ تربیت کا بھی ہے۔ آج اردو صحافیوں کو تربیت دینے کا کوئی مرکز یا ادارہ نہیں ہے جہاں وہ تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو اخبارات میں کام کریں۔ اگر صحافیوں کو تربیت دینے والا کوئی سرکاری ادارہ نہیں ہے تو پرائیویٹ ادارے ہی قائم کرنا چاہیے۔

اردو اخبارات کا ایک مسئلہ دیر رات تک کام کرنے (لیٹ نائٹ شفٹ) کا بھی ہے۔ بہت کم اخبارات ایسے ہیں جو نو دس بجے کے بعد کی خبریں لیتے ہیں۔ بیشتر اخبارات میں لیٹ نائٹ شفٹ کا تصور ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے رات میں نو دس بجے کے بعد کے واقعات ان میں نظر نہیں آتے۔ روزنامہ ''قومی آواز'' میں پہلے صبح کے تین بجے تک شفٹ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب وہاں بھی ایک بجے تک یا زیادہ سے زیادہ دو بجے تک اردو مشین پر آئی ہوئی خبریں ہی لی جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے؟ بنیادی بات یہ ہے کہ اب وہ زمانہ گزر گیا جب اردو صحافت مشن ہوا کرتی تھی۔ اب اردو صحافت کو خدمت نہیں راست تجارت بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یا تو باہمی تعاون کی بنیاد پر ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو اردو صحافت کی کفالت کرسکیں یا پھر حصص کی بنیاد پر صحافتی تجارت کو پروان چڑھائیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اردو اخبارات اپنے معاشرے کے لیے کیا کرسکتے ہیں اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کیا کچھ خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اردو اخبارات کو چاہیے کہ وہ اردو والوں کی امنگوں، آرزوؤں اور خواہشوں کی غیر جذباتی نمائندگی کریں۔ اس سلسلے میں اردو اخبارات اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو اپنی آواز میں تاثیر پیدا کرسکتے ہیں۔ گوانٹانا موبے میں قرآن شریف کی بے حرمتی کے واقعے پر پوری دنیا کے مسلمان اور پوری دنیا کے اردو اخبارات بیک آواز احتجاج کررہے ہیں۔ گویا مذہب کے معاملے میں تمام سرحدیں مٹ جاتی ہیں اور پوری دنیا کی مسلم کمیونٹی ایک ہوجاتی ہے۔ اردو اخبارات اس صورت حال سے سبق لے سکتے ہیں اور اس کمیونٹی کو تعلیم یافتہ بنانے میں بھی نمایاں کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو اخبارات کے قارئین کی تعداد میں نہ صرف اضافہ ہوگا بلکہ اردو صحافت کی بنیاد بھی مضبوط و مستحکم ہوسکے گی۔ □□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کے سیاسی تدبر، علمی فتوحات اور صحافتی خدمات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں سائنس سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے آزادی کے بعد بطور وزیر تعلیم ملک کو سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تنقید عقل محض

مصنف: اِمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ جرمن مابعد طبعیاتی فلسفے کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے جو براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین نے مصنف کے خیالات کی وضاحت اور زبان کی سلاست کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور منشائے مصنف تک قارئین کی رسائی کو آسان کردیا ہے۔ یہ کتاب 1948 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر انجمن اور محترمہ صغریٰ مہدی کی اجازت سے کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے

ہری بھری دنیا کے لیے

مصنف: ایرا اسکینہ/ مترجم: طلعت گل

ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صفحات: 118، قیمت: -/28 روپے

بھارت 2004

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور لسانی منظرنامے سے مستند واقفیت حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: -/250 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

رام پرکاش کپور

رسالہ "رہنمائے تعلیم" کا ادبی سفر

ماہنامہ رسالہ "رہنمائے تعلیم" نے بغیر کسی وقفے کے اپنی اشاعت کے سو سال پورے کر لیے ہیں اور اس کی صد سالہ تقریب منانے کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ "رہنمائے تعلیم" کی مسلسل اشاعت کی اس صدی میں اٹھاون سال آزادی کے بعد کا عرصہ ہے جس میں آزادی کے فوراً بعد کا وہ زمانہ بھی شامل ہے، جب خودغرض سیاسی لیڈروں نے ہندو مسلم منافرت کا زہر پھیلا کر اردو کی حسین اور رواداری کی دنیا میں افتراق اور انتشار پیدا کر دیا تھا اور ہماری آپ کی پیاری زبان، ہندوستان کی گنگا جمنی روایات کی امین زبان، مادر وطن کی ادبی عظمت کا نشان، قومی یگانگت اور اتفاق باہم کی مجسم زبان، امن و دوستی، اتحاد و یک جہتی کی زبان، متحدہ قومیت، مشترکہ تہذیب و ثقافت، مذہبی رواداری، انسانیت اور انسان دوستی کے جذبے سے سرشار زبان، سیکولر زبان کی علامت اردو زبان، پر تقسیم ملک کی ذمے داری کا الزام لگا کر فرقہ پرست طاقتوں نے اس کو ملک بدر کرنے کی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ کچھ ارباب اقتدار بھی ان سازشوں میں شریک تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو کے بارے میں کسی طرح کی بھی کوئی اچھی بات کرنے والا سماج مخالف سمجھا جاتا تھا اور خفیہ پولیس اس کے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیتی تھی۔ ریلوے بک اسٹالوں سے بھی اردو کی کتابیں اور رسالے غائب ہو گئے تھے۔ ایسے آزمائشی دور میں جب اردو اپنے ہی گھر میں غیر ملکی اور غیروں کی زبان بنا دی گئی تھی۔ کچھ سرپھرے مجاہدین اردو نے اس مظلوم زبان کا علم بلند کیے رکھا اور بغیر کسی اردو ادارے، اردو اکادمی یا کسی بڑی شخصیت کی امداد کے محض اپنے بل بوتے پر اس رسالے کو جاری رکھا اور اس کی اشاعت میں کوئی وقفہ نہیں آنے دیا اور وہ تھے آنجہانی ماسٹر سردار جگت سنگھ، ان کے قابل فرزند سردار ہربجن سنگھ اور ان کے معاونین۔

رسالہ "رہنمائے تعلیم" کے بانی سردار جگت سنگھ مرحوم تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک اسکول میں استاد تھے۔ انھوں نے 1905 میں اپنے گاؤں پنڈی گھیپ (ضلع راولپنڈی، حال پاکستان) سے ایک نہایت صاف ستھرا اور طلبہ و نوجوانوں میں صالح تعلیمی و علمی مذاق پیدا کرنے کی غرض سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کا نام رسالہ "رہنمائے تعلیم" رکھا۔ بعد میں 1907 میں جب ماسٹر جگت سنگھ جی اپنے گاؤں سے لاہور منتقل ہوئے تو ان کے ساتھ ان کا رسالہ بھی لاہور آ گیا۔ لاہور ان دنوں کافی بڑا علمی و تعلیمی مرکز تھا اور وہاں سے متعدد معیاری ادبی اردو رسالے شائع ہوتے تھے۔ بہت جلد ہی رسالہ "رہنمائے تعلیم" نے اس ادبی ماحول میں اپنا مقام بنا لیا تھا اور اس کی چالیس سال کی اشاعت کے دوران متعدد ضخیم اور جامع خصوصی نمبر بھی شائع کیے گئے اور اسے کئی علمی و ادبی شخصیات کا تعاون حاصل رہا جن کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی رہیں۔

1947 میں سردار جگت سنگھ کے ساتھ رسالہ "رہنمائے تعلیم" بھی لاہور سے منتقل ہو کر دہلی میں "پناہ گزیں" ہو گیا۔ تقسیم کے دردناک سانحے، فسادات کے طوفان اور حادثاتِ زمانہ کی وجہ سے اپنا سب کچھ کھو کر جب سردار جگت سنگھ دہلی میں وارد ہوئے، تب بھی اور اس وقت کے ہنگامی حالات میں بھی وہ اپنے مقصدِ زندگی سے دست بردار نہیں ہوئے اور اپنے جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ کر رسالہ ہٰذا کی خدمت میں لگے رہے۔ اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ تقسیم کے حادثے نے بھی اس کے تسلسل کو اثر انداز نہیں کیا۔ جولائی 1947 کا شمارہ لاہور سے نکلا، تو اگست 1947 کا شمارہ دہلی سے شائع ہوا اور کوئی رخنہ اس کی اشاعت کے تسلسل میں رکاوٹ نہ بن سکا، حالانکہ اس دوران میں ان کی اپنی رہائش کا بھی کوئی تسلی بخش انتظام نہیں تھا۔ بعد میں اس کے کئی قابل قدر خصوصی نمبر بھی شائع کیے گئے جن میں انھوں نے لاہور کی اشاعت کے وقت کی شاندار روایات کو قائم رکھا۔ پنجاب کے ایک دانشور سیفی پریمی نے آنجہانی سردار جگت سنگھ کو سرسید احمد خاں کا وارث قرار دیا تھا۔

1962 میں سردار جگت سنگھ کی وفات کے بعد بھی اردو کے نامساعد حالات اور اہل اردو اور اردو اداروں کی بے حسی، بے اعتنائی اور لاپرواہی کے باوجود ان کے لائق فرزند جناب سردار ہربجن سنگھ تھاپر اس رسالے کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھیوں جناب ڈاکٹر تسخیر فہمی مدیر اعلیٰ (اعزازی) اور جناب قمر سنبھلی معاون مدیر اور دیگر معاونین کے بے غرض اور پرخلوص تعاون سے جس خاموشی اور استقلال کے ساتھ بلاتامل اپنی شاندار روایات کو قائم رکھتے ہوئے مسلسل اور بروقت اس رسالے کو اردو دوستوں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ تمام اردو والے ان مجاہدین اردو کی اولوالعزمی کو سلام کرتے ہیں۔

میرے خیال میں برصغیر ہند و پاک اور اردو کی نئی بستیوں کے کسی بھی اردو رسالے کو سوائے رسالہ رہنمائے تعلیم کے صدی پوری کرنے کا اعزاز

حاصل نہیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے کسی رسالے کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ میرے علم کے مطابق دنیا کی بڑی زبانوں میں بھی بہت کم ادبی رسالوں کو اپنی مسلسل اشاعت کے سو سال پورے کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہوگا۔

اردو کے ایک اور نہایت مقبول و معیاری رسالے ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی نے بھی اپنی اشاعت کے 76 سال پورے کر لیے ہیں۔ لیکن اس رسالے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی خاندان کی تیسری نسل کو منتقل ہوا ہے۔ 76 سال پہلے اردو کے مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی مرحوم نے آگرہ سے یہ رسالہ جاری کیا تھا۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان کے بیٹے نے اسے جاری رکھا اور اب ان کے پوتے اسے اسی شان و شوکت کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ بھی رسالہ ''رہنمائے تعلیم'' کی طرح ہی اپنی صدی پوری کرے گا۔

اردو کے کسی جریدے کی طویل مسلسل اشاعت کے سلسلے میں ایک اور جریدے کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں جناب بشارت فروغ، رام پور نے رسالہ'' رہنمائے تعلیم'' میں ستمبر 2002 کے شمارے میں چھپے اپنے مکتوب میں ذکر کیا تھا۔

''رام پور سے ایک ادبی سیاسی ہفت روزہ شائع ہوتا تھا'' دبدبہ سکندری''۔ یہ 1866 سے 1958 تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس وقت دفتر'' دبدبہ سکندری'' میں پوری فائل موجود تھی۔ لیکن اب چند شماروں کے علاوہ ریکارڈ نہیں ملتا............''

لیکن چونکہ یہ ایک سیاسی ہفت روزہ تھا۔ اس لیے اسے ادبی رسالوں کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ آخر میں آمدم برسر مطلب — '' رسالہ رہنمائے تعلیم'' کی صد سالہ تقریب کے سلسلے میں منعقد ہونے والی تقریبات کو اس عظیم زبان کے شایانِ شان بنانے کے لیے میں تمام محبانِ اردو، اردو اکادمیوں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، انجمن ترقی اردو (ہند) ساہتیہ اکادمی اور دیگر سرکاری و غیر سرکاری اردو اداروں سے ماہنامہ'' اردو دنیا'' کی وساطت سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ رسالہ'' رہنمائے تعلیم'' کے لیے فراخ دلی سے تعاون کریں اور حسب استطاعت معاونت فرمائیں۔

L.C.G. 04, P.H.A., Laburnum, Sector-28,
Gurgaon-122 002, (Haryana)

□□□

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام بہ تعاون ارون تیواری

مترجم: حبیب الرحمٰن چغانی

ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام ایک ماہی گیر کے گھر پیدا ہوئے اور اپنی محنت، لگن اور خود اعتمادی کی بدولت صدر جمہوریہ کے باوقار عہدے تک پہنچے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے اعلا منصب پر فائز ہونے سے قبل اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسے میزائلوں کی تیاری، ملک کی سائنسی اور دفاعی پیش رفت اور ہندستان کو ایک نیوکلیائی طاقت بنانے میں ان کا جو کردار رہا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ خودنوشت خود اعتمادی کے پیکر ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی داستانِ حیات کے ساتھ ساتھ ملک کی سائنسی ترقی کی داستان بھی ہے۔

صفحات: 201، قیمت -/177 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظرنامہ

مصنف: گلزار

اردو میں منظرنامہ ایک نئی صنفِ ادب ہے جو فلم کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غالب کی حیات و شخصیت پر گلزار کے شاہکار سیریل ''مرزا غالب'' کا یہ منظرنامہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے نہ صرف غالب کی حد درجہ دلچسپ، پیچیدہ اور پہلودار شخصیت کی کئی پرتیں یکے بعد دیگرے کھلتی جاتی ہیں بلکہ عہد غالب کی تہذیب و ثقافت بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔

صفحات: 236، قیمت -/395 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی آب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلامِ دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت :-/258 روپے

کلیاتِ علی سردار جعفری (جلد اوّل)

مرتب: علی احمد فاطمی

علی سردار جعفری ایک شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، نقاد، مفکر اور دانشور ہی نہیں ادب، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے گہرے رمز شناس بھی تھے۔ کونسل نے ان کی تمام تحریروں کو کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں کلیاتِ علی سردار جعفری کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں ان کے مجموعہ ہائے کلام ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' شامل ہیں۔

صفحات: 496، قیمت :-/164 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد عارف اقبال

اشاعتی ادارے اور اردو ناشرین کی ذمے داریاں

موجودہ دنیا جسے اب عالمی گاؤں (Global Village) بھی کہا جاتا ہے، دراصل اطلاعات کا سمندر بن گئی ہے جس میں زیادہ تر ادھوری معلومات کی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں۔ اس معلومات کے سمندر میں اطلاع کے ساتھ غلط اطلاع دینے (Misinformation)، اطلاع نہ دینے (Uninformation)، معلومات کی غلط توجیہ کرکے غلط فہمی پیدا کرنے (Disinformation) اور معلومات کی یقینی صورت حال کو مسخ کرکے اس کے توازن کو اپنے حق میں بنا کر پیش کرنے یا افراط و تفریط پر مبنی معلومات (Misinterpretation) جیسی مشتعل موجیں اہل علم و دانش کے قلب و ذہن میں مسلسل ہیجان برپا کر رہی ہیں جس کے سبب موجودہ دور کا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ عالم ہے حالانکہ اس کے پاس علم نہیں بلکہ وہ کسی حد تک خبر رکھتا ہے۔ چند ہی ایسے خوش قسمت اہل علم ہوسکتے ہیں جو دور حاضر میں اطلاعات اور معلومات کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر موتی پالیتے ہوں گے۔

انٹرنیٹ کے انقلاب کے ساتھ ہی معلومات یا علوم کے اتنے شعبے اور ہر ایک کے اتنے ذیلی شعبے قائم ہوگئے ہیں کہ خود ایک موضوع کا کسی ایک فرد کا مکمل احاطہ کرلینا ناممکنات میں سے ہے۔ ایسے دور میں اردو کے اشاعتی اداروں کی ذمے داریاں دو چند ہوجاتی ہیں کیونکہ اردو ناشرین کا مکمل انحصار جن ذرائع پر ہوتا ہے ان میں انٹرنیٹ کے علاوہ دیگر زبانوں کی کتابوں کے تراجم یا ایسے مصنفین کی کتابیں ہیں جو خود خبروں کے سیلاب میں بہہ چکے ہوتے ہیں۔ ان کی ذمے داری دو چند اس لیے ہے کہ اس زبان میں شائع شدہ کتابیں ایک خاص طبقے کو غذا فراہم کرتی ہیں اس لیے اردو ناشرین کو مزید حساس اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

کسی بھی اشاعتی ادارے کے لیے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ وہ کس طرح کے قارئین کے لیے کتابیں شائع کرنا چاہتا ہے۔ ہندی اور انگریزی ناشرین کے مقابلے میں عام طور سے اردو ناشرین فنی اور تکنیکی لحاظ سے ابھی تک پچھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں کم از کم 16 سے 20 زبانوں کے ناشرین ہیں جہاں بیرون ملک کی متعدد زبانوں سے صوبائی اور علاقائی زبانوں میں ترجمے کا کام جاری ہے۔ اس کے باوجود انگریزی زبان کی کتابوں کو جو فوقیت حاصل ہے شاید کسی اور زبان کی کتابوں کے نصیب میں نہیں۔ حتی کہ دیگر ملکوں کی تازہ انگریزی کتابوں کے نقلی ایڈیشن بھی یہاں کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ کتابیں ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہروں اور ریلوے پلیٹ فارم کے بک اسٹالوں پر دکھائی دیتی ہیں تاہم ملک میں انگریزی کتابوں کے ناشرین نے کتابوں کی طباعت و اشاعت کا جو معیار قائم کر رکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس کا مکمل ادراک ہے کہ اشاعت کتب ایک باوقار اور سنجیدہ پیشہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کتابوں کی تقسیم کا ایک صحت مند نیٹ ورک بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت میں فنی مہارت کی نمایاں جھلک کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے بعض انگریزی کتابوں کے ناشرین کی کتابیں معلومات، فن اور گٹ اپ کے لحاظ سے بیرون ملک کے اشاعتی اداروں سے مسابقت رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس اردو ناشرین کی صورت حال لائق توجہ ہے۔ آفسیٹ کی رنگارنگ طباعت کے انقلاب نے کتابوں کے سرورق کو خوشنما بنانے کی جانب یقینی طور پر متوجہ کیا ہے لیکن پیشے کے اعتبار سے ایک اشاعتی ادارے کی تشکیل، اس کے لوازمات، قانونی اصول و ضوابط، تکنیکی اور فنی مہارت، ادارتی امور، پروڈکشن کا معیار اور قارئین کی ضرورت کے لحاظ سے اب بھی ہمارے اردو ناشرین سنجیدہ نہیں دکھائی دیتے بلکہ بعض ناشرین کو یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ انھیں ''کیا چھاپنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' وہ ایک طرح کی بے سمتی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اس لیے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ انفارمیشن کی دنیا کی ترجیحات اور مکمل منصوبہ بندی کے بغیر اشاعتی ادارے کو معیار مطلوب تک لے جانے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں موجودہ دور میں ایک اہم مسئلہ سرمایہ کاری کا بھی ہے۔ اردو ناشرین کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ اس پیشے کو اختیار کرنے کے لیے کم از کم کتنے سرمائے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ موجودہ دور میں 50 لاکھ سے ایک کروڑ کا سرمایہ بھی کسی اشاعتی ادارے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس سے زائد سرمائے کی بنیاد پر ہی کوئی معیاری اشاعتی ادارہ اپنے مقصد تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اردو کے چند کتابچے، دینی اور ادبی کتب کی اشاعت کے بعد ہی بعض حضرات اپنے کو ناشرین کتب کی فہرست میں شامل کرنے لگتے ہیں۔ یہ رجحان اردو والوں کے یہاں اب عام ہے۔ ایک مثالی اشاعتی ادارے کی کم سے کم چار قسم کی بنیادی اخلاقیات

ہوسکتی ہیں۔

علمی اخلاقیات

ناشرین کو سب سے پہلے اپنا نصب العین طے کر لینا چاہیے کہ وہ کن کن موضوعات پر کتابیں شائع کرسکتے ہیں اور ان کے قارئین کون ہوسکتے ہیں تاکہ ان ہی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے بہتر اور معیاری کتابیں شائع کی جاسکیں۔

متعین موضوعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہتر مصنفین اور اس فن سے متعلق تجربہ کار افراد کا انتخاب ناگزیر ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ممتاز اور شہرت یافتہ مصنفین کی ہی خدمات لی جائیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے افراد مل سکتے ہیں جن کو اگرچہ مصنف یا مترجم ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوسکا ہے لیکن ان کے اندر بہترین صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔

کتابیں ایسے موضوعات کے تحت تصنیف کرانی چاہئیں جو ہمارے مسائل کو اجاگر کرنے اور انھیں حل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے علمی سرمایہ ثابت ہوں تاکہ مستقبل میں بھی اس سے استفادہ کیا جاسکے۔

اسلاف اور بزرگوں کی ایسی کتابوں کی اشاعت بھی کی جائے جو اب تاریخ کا حصہ تو ہیں لیکن نئی نسل ان سے واقف نہیں۔ ان کتابوں کو نئے انداز سے مرتب و مدون کرکے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا علمی ورثہ نئی نسل تک منتقل ہوسکے۔

نئی کتاب تیار کرتے وقت یہ بات ملحوظ رہے کہ اس کی زبان سلیس اور اسلوب نگارش میں شگفتگی ہو نیز اعلیٰ ادبی معیار کا بھی حامل ہو۔

عربی اور فارسی کے اہم کتابوں کے تراجم شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ نئی نسل قدیم علمی ورثے سے مستفید ہو۔

سرقہ (Piracy) سے حتی الامکان گریز کیا جائے البتہ بعض ایسی کتابیں جن کے بارے میں یہ اعلان کردیا گیا ہو کہ کوئی بھی اسے شائع کرسکتا ہے، سرقہ کے زمرے میں نہیں آتیں۔ اسی طرح ایسی دعوتی اور دینی کتابیں جن کی طباعت وتشہیر سے دعوتی اور تعمیری فریضہ ادا ہوتا ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک دعوتی وتعمیری پیغام پہنچ سکے، سرقہ نہیں کہلاتی۔

ناشر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی مصنف کے ساتھ علمی بددیانتی نہ کرے۔ مثلاً اگر وہ کسی مصنف کی کتاب شائع کرنے کا حق رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کتاب کے فلاں پیراگراف کو حذف کردیا جائے اور کسی جملے کو بدل دیا جائے تو اسے بددیانتی کہیں گے جس کے لیے ناشر کو عنداللہ جوابدہ ہونا ہوگا الا یہ کہ کوئی ناگزیر سبب یا حکمت پیش نظر ہو لیکن اس صورت میں بھی ادارتی نوٹ ضرور دیا جائے۔

سرقہ کی ایک بدترین قسم یہ بھی ہے کہ بعض ناشرین کسی مصنف کی کتاب کو شائع کرتے وقت اصل مصنف کا نام خارج کرکے اپنا یا کسی دوسرے کا نام لکھ دیتے ہیں۔ یہ صریحاً بددیانتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی تیاری میں اس کا اہتمام لازما کیا جائے کہ جس کتاب کے کسی پیراگراف کا حوالہ دینا مقصود ہو تو اس کتاب کا پورا نام، ایڈیشن، سن اشاعت اور صفحہ نمبر درج کیا جائے۔

اگر کسی کتاب کی تیاری میں ایک سے زائد افراد یا مشیر کا تعاون کسی بھی مرحلے میں حاصل رہا ہو تو نام بنام کتاب کے پیش لفظ سے قبل مصنف یا مرتب کی جانب سے اظہار تشکر (Acknowledgement) کیا جائے نیز کتاب میں غیر ضروری تقریظ کو شامل کرنے سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے۔ کتاب کا پیش لفظ خود مصنف/مرتب/مترجم کی جانب سے لکھا جائے اور اس میں کتاب لکھنے کے مقاصد پر جامع روشنی ڈالی جائے۔

کتابوں کے لیے املا کا معیار مقرر کیا جائے اور ناشر اپنی کتابوں میں مقرر کردہ املا کی پابندی کرائے تاکہ املا میں یکسانیت برقرار رہے۔ املا کا معیار مقرر کرتے وقت ناشر کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ املا نامے کی نئی سفارشات میں جو بعض ناقابل قبول سفارشات دی گئی ہیں ان سے اجتناب کس طرح ممکن ہے بالخصوص غیر علمی اور غیر عملی املا کی سفارشات سے کلیتاً اجتناب کی ضرورت ہے۔

ناشر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کتاب میں تاریخی بحث ہو اس سلسلے میں حساس اور سنجیدہ رویہ اختیار کرے تاکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تاریخی حقائق مسخ نہ ہوں۔

حکایات اور واقعات پر مبنی کتابوں میں مستند روایت پر ہی اعتبار کیا جائے۔ کسی بھی واقعہ یا حکایت کو بغیر مستند حوالے کے اپنی کتاب میں نقل نہ کیا جائے۔

(بحوالہ: مقدمہ ابن خلدون، ص۔170 تا 173، طبع دہم 1986، نفیس اکیڈمی کراچی)

تکنیکی اخلاقیات

اشاعت کتب کے فن میں یورپ اور امریکہ کا معیار یقینی طور پر ہمارے لیے قابل تقلید ہے لہٰذا موجودہ دور کی ضرورت کے پیش نظر ہر ناشر کے لیے لازمی ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں اسی طرز اور معیار کے مطابق کتابوں کی

تیاری کا اہتمام کرے۔

کتابوں میں حوالہ جات، کتابیات اور اشاریہ کے اہتمام سے معیار اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ناشر کو اس کا ادراک ہونا چاہیے کہ یہ قارئین کی ضرورت ہے لہٰذا اردو کتابوں میں ان باتوں پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

عام طور پر اردو ناشرین کے یہاں کسی کتاب کا مسودہ مصنف یا مترجم سے حاصل کرنے کے بعد کاپی ایڈیٹنگ کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ حالانکہ کوئی ضروری نہیں کہ مصنف کا مسودہ زبان واسلوب، قواعد اور ادبی معیار کے مطابق ہو۔ کیونکہ مصنف فکر وخیال عطا کرتا ہے، اس کے تحریر کردہ مسودے میں غلطیاں ہوسکتی ہیں خواہ تکنیکی نوعیت ہی کی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا مسودے کو کتابی شکل میں لانے سے قبل ابتدا ہی میں کاپی ایڈیٹر کے ذریعے مسودے کو درست کرالینا ضروری ہے۔ کاپی ایڈیٹنگ میں عام طور پر زبان و بیان، قواعد اور حوالہ جات کی درستگی کی جانچ پڑتال، کتاب کا سائز، سطروں کا تناسب، سرخی اور جلی وخفی حروف کی نشاندہی وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ اس طرح سے کتاب کا مسودہ تکنیکی اور فنی اعتبار سے درست اور صاف ستھرا ہونے کے بعد ہی کاتب یا کمپوزر کے حوالے کیا جائے جس سے کمپوزنگ کی اسٹائل شیٹ بھی منسلک ہو۔ کسی کتاب کی کمپوزنگ سے قبل اس طرح کے اہتمام سے آئندہ بہت سی زحمتوں سے نجات مل جاتی ہے اور کتاب کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔

ناشر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قارئین کے ذوق اور معیار کو نظر انداز نہ کرے اور ان کی سہولیات کا بھرپور خیال رکھے۔ مثلاً نصابی کتابوں کی تیاری کا معاملہ جو ایک اہم لیکن مشکل ترین فن ہے کیونکہ ان ہی کتابوں کو پڑھ کر ایک نسل پروان چڑھتی ہے اور اس کی فکری، ذہنی، ادبی اور علمی نمو میں یہ کتابیں براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں لہٰذا اس میدان میں کام کرنے والوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ فنی باریکیوں پر توجہ دینی چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن طلبہ کے لیے یہ کتابیں تیار کی جارہی ہیں ان کی عمر کتنی ہے؟ کس عمر کے بچے کے لیے حروف کا سائز اور اس کی زبان کا معیار کیسا ہونا چاہیے۔ اسی طرح درسی کتابوں میں سائنس، سماجیات اور ریاضی کی کتابوں میں (پانچویں کے بعد) اہم اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ کا اہتمام کیا جائے۔ اگر کتاب اردو یا ہندی میں ہو تو اس کی اصطلاحات کے انگریزی مترادفات سے بھی طلبہ کو روشناس کرایا جائے۔ غرض ہر فن کی کتاب میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ قارئین کے لیے اس میں اس فن کے مطابق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں تبھی ایک ناشر عہد حاضر کے مسابقتی دور میں کامیاب ہوسکتا ہے نیز فن اور معیار دونوں اعتبار سے بہترین ناشر کہلانے کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتابوں کو بین الاقوامی معیار پر لانے کے لیے بین الاقوامی کیٹلاگنگ کا نظام قائم ہے۔ عام طور پر اسے International Standard Book Numbering (ISBN) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے ہر ملک میں سرکاری سطح پر متعارف کرانے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ شعبہ ہمارے ملک میں وزارت ترقی انسانی وسائل کے زیرنگرانی Raja Ram Mohan Roy National Agency for ISBN کے نام سے قائم ہے جس کا دفتر دہلی میں کرزن روڈ پر واقع ہے۔ ہر ناشر اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ ممبر بننے کے بعد اس ایجنسی سے مخصوص نمبروں کا لاگ بک (Log Book) دیا جاتا ہے جس میں ملک اور ناشر کا کوڈ نمبر بھی ہوتا ہے۔ اب ہر ناشر اپنی کسی بھی کتاب کو شائع کرنے سے قبل اس نمبر کو دی گئی ہدایات کے مطابق اپنی کتاب میں شائع کرسکتا ہے لیکن اس نمبر کے استعمال سے قبل مذکورہ ایجنسی سے پیشگی اجازت لینی پڑتی ہے۔ یہ ایجنسی کتاب کے اندراجات کی جانچ کرنے کے بعد ناشر کو فی الفور شائع کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ ISBN کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ناشر کی کتابیں بین الاقوامی بازار میں فروخت ہونے کے لائق ہوجاتی ہیں۔

قانونی اخلاقیات

ملک کے قانون کی رو سے ایسی کتابیں شائع نہ کی جائیں جو ممنوع قرار دی گئی ہوں۔

ناشرین عام طور پر مصنفین کی رائلٹی کی ادائیگی میں انتہائی بخل سے کام لیتے ہیں حالانکہ ناشر کی طرف سے مصنف کو طے شدہ رقم کی ادائیگی کے باوجود جس طرح کی خدمت ایک مصنف یا مترجم انجام دیتا ہے اس کی حقیقی ادائیگی ناممکن ہے لہٰذا اس سلسلے میں ناشرین کو حساس ہونا چاہیے اور رائلٹی یا اجرت کی ادائیگی کو اپنا اولین فرض سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔

اگر مصنف سے قیمت فروخت کی بنیاد پر رائلٹی طے ہے تو اس کی کتاب کے ہر ایڈیشن پر مقررہ فیصد کے مطابق رائلٹی ادا کی جانی چاہیے۔ عام طور پر زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کے سال میں ایک سے زائد ایڈیشن بھی شائع ہوتے ہیں لیکن اکثر ناشرین اس سلسلے میں ''لاعلمی'' کے اظہار سے ایک سے زائد ایڈیشن کی رائلٹی ادا کرنے میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف کا قانونی حق ہے کہ وہ ناشر سے اپنا معاہدہ منسوخ کردے۔ ناشرین کی طرف سے اس کوتاہی کے سبب اب مصنف بھی اپنی تصنیف کے لیے یک مشت رقم کا مطالبہ کرنا بہتر تصور کرنے لگے ہیں۔

جب کسی نئی کتاب کا اجرا ہوتا ہے تو کتاب کی اشاعت کے 30 دنوں کے اندر ملک کے چار بڑے قومی کتب خانوں کو کم از کم ایک عدد کتاب ارسال کرنی ضروری ہے ورنہ The Delivery Books (Public Library) Act 1954 کے تحت قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے لہٰذا ہر ناشر کو ان کتب خانوں کو اپنی تازہ کتاب کا ایک نسخہ لازماً ارسال کرنا چاہیے۔ ان کے پتے درج ذیل ہیں۔

- National Library
Belvedre
Kolkata-700027
- Central Library
Town Hall
Mumbai-400001
- Connemara (State/Central)
Public Library
Pantheor Road, Egmore
Chennai-600008
- Delhi Public Library
S.P. Mukherjee Marg,
opp: Delhi Rly. Station
Delhi-110006

اس قانونی عمل سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں ہم قانونی طور پر اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوجاتے ہیں وہیں ہماری کتابیں ملک کے چار بڑے کتب خانوں کی فہرست (Catalogue) میں محفوظ ہوجاتی ہیں۔ عام طور پر اسی کیٹلاگ کی بنیاد پر ناشرین کی کتابوں کی سروے رپورٹ بھی تیار کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناشر ملک کے دیگر اہم کتب خانوں اور اخبارات ورسائل کو بھی اپنی کتاب کا ایک ایک نسخہ بطور پبلسٹی ارسال کرسکتے ہیں۔ اس سے کم صرفہ میں نئی کتاب کی تشہیر ہوجاتی ہے۔ ناشرین کا یہ عمل مارکٹنگ کا حصہ بھی ہوسکتا ہے۔

اگر کسی مسودے میں مصنف یا مرتب نے متنازع مسئلے کو اٹھایا ہے تو اشاعت سے قبل اس مسودے پر ماہرین کی رائے ضرور لینی چاہیے۔ اس سلسلے میں کسی قانون داں کا مشورہ مفید ہوسکتا ہے تاکہ اشاعت کے بعد کسی قانونی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اب کاپی رائٹ (Copyright) کی مدت 50 کے بجائے 60 برس کر دی گئی ہے۔ Copyright Act 1957 پر نظر ثانی کرتے ہوئے 1991 میں مزید دس سال کا اضافہ کیا گیا ہے مثلاً اگر کسی مصنف کی کوئی کتاب مصنف کی حیات میں شائع ہوئی اور اس کا انتقال 1945 میں ہوگیا تو اب اس کی کتاب کی کاپی رائٹ 1995 میں نہیں بلکہ 2005 میں ختم ہوگی۔ اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو ناشرین بھی ایسی دستاویزی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ انگریزی میں بعض ناشرین برسوں سے اس طرح کے مصنفین کی کتابیں شائع کررہے ہیں۔

معاشرتی اخلاقیات

ناشر کو چاہیے کہ وہ تعصبات کو ہوا دینے اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے مواد کی اشاعت سے کلی طور پر اجتناب کرے۔

فحش اور غلیظ قسم کی کتابوں کی اشاعت ہرگز نہ کرے۔ ملکی و مذہبی قوانین میں بھی ایسے کتب کی اشاعت کی ممانعت ہے۔

ایسے افسانوی اور ڈرامائی لیکن فحش اور مخرب اخلاق ادب کی اشاعت سے بھی اجتناب کیا جانا چاہیے جسے لبرلائزیشن کے نام پر چھاپ کر پیسے کمانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے نئی نسل کے اذہان آلودہ ہوتے ہیں۔

عریاں یا نیم عریاں تصاویر کی اشاعت سے بھی اجتناب کیا جانا چاہیے۔

ناشر کو اپنی کتاب میں کسی بھی شخصیت کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جس سے فرقہ وارانہ منافرت کو بڑھاوا ملتا ہو البتہ ناگزیر صورت حال میں تاریخی اعتبار سے کسی شخص کے منفی یا دوہرے کردار کا ذکر ضروری ہو تو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

تاریخی اعتبار سے بددیانتی پر مبنی کسی بھی طرح کے مواد کی اشاعت نہ کی جائے۔ اس سے معاشرے میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ناشر کو ہمیشہ چاق و چوبند رہنا چاہیے۔

عام طور پر کتابوں کی قیمت کے بارے میں قارئین کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ اکثر ناشرین کتاب کی قیمت متعین کرتے وقت صرف اپنی آمدنی کا خیال رکھتے ہیں لیکن بعض ناشرین اس سلسلے میں حساس بھی ہیں اور اپنی کتابوں کی مناسب قیمت متعین کرتے ہیں۔ لیکن اردو ناشرین کے یہاں زیادہ قیمت رکھنے کا اصول رائج ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کتابیں مخصوص کتب خانوں کو تو فروخت کی جاسکتی ہیں لیکن عام قارئین تک وہ کتابیں نہیں پہنچ پاتیں۔ لہٰذا اردو ناشرین کو اس پر بھی خصوصی طور سے توجہ دینی چاہیے۔

1739/3, (Zaily Manzil), New Kohenoor Hotel,
Patodi House, Darya Ganj, New Delhi-110002

□□□

محمد محمود فیض آبادی

مہاتما گاندھی اور سیکولر ریاست

سیکولرزم اور سیکولر ریاست آزادی کے بعد سے ہندوستان میں متنازع فیہ اصطلاحات رہی ہیں۔ کیوں کہ دستور ہند میں سیکولر ریاست کی کوئی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ وسیع طور سے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان اس لیے ایک سیکولر ریاست ہے کیوں کہ یہاں کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ملک میں رہنے والے تمام افراد کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن اگر ہم سیکولر ریاست کے معنی کو مغرب کے سیاسی فلسفے اور سیاسی نظام سے اخذ کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ وہاں فرانس کے سوا کسی ملک کے دستور میں سیاسی نظام کے لیے ''سیکولر'' کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی ہے لیکن ایک غیر مذہبی ریاست کے جملہ لازمی عناصر سب میں مشترک ہیں۔ ان میں پہلا عنصر یہ ہے کہ چرچ کو ریاست سے علاحدہ رکھا جائے۔ یعنی چوں کہ معاشرے میں مختلف مذاہب موجود ہیں لہٰذا کسی ایک مذہب کو دوسرے پر مسلط نہ کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست اپنی پالیسی کی تشکیل میں مذہبی اصولوں کی پیروی سے آزاد ہو۔ اسی کے ساتھ مملکت کا قانون تمام افراد اور مذہبی تنظیمات کو مذہبی آزادی اور سرگرمی کی ضمانت دے۔ سیکولر ریاست کا جوہر یہ ہے کہ نہ ریاست چرچ کے معاملات میں دخل دے نہ چرچ کو ریاست کے امور میں دخل دینے کا حق ہو۔ اس اصول کو ریاست کی مذہبی غیر جانبداری کہا جاتا ہے۔ یہاں سے دوسرا اصول نکلتا ہے کہ ریاست کے ہر شہری کا درجہ شہری ہونے کے ناطے متعین کیا جائے نہ کہ اس کے مذہب یا نسل کی بنیاد پر۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ ریاست کسی بھی شہری کے ساتھ اس کے مذہب، نسل کی بنیاد پر امتیاز نہ کرے۔ ایک چوتھا اصول یہ ہے کہ ریاست کسی بھی مذہب کی سرپرستی نہ کرے اور نہ مذہبی اداروں کو مالی امداد دے۔ اب جہاں تک دستور ہند کا تعلق ہے اس کی کسی بھی دفعہ میں یہ نہیں لکھا گیا کہ ریاست مذہبی معاملات میں غیر جانب دار رہے گی بلکہ اس کے برعکس مذہبی معاملات میں مداخلت کے حق کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ریاست کی پالیسی کو قدیم فارمولا ''سردھرم سمبھاؤ'' (مساوات بین الادیان) کا پیرو بنایا گیا ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ ریاست سارے مذاہب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے لیکن عملی زندگی میں زیادہ امکان اس کا ہے کہ کوئی خاص مذہب دوسروں سے زیادہ مساوی ہو جائے۔

اس ابہام اور اشکال کے بالمقابل جب ہم بابائے قوم مہاتما گاندھی کے سیاسی تصورات کا جائزہ لیتے ہیں بالخصوص 1947 کی تقسیم ہند کے بعد تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مذہبی عقائد اور رجحانات کے باوجود وہ حکومت و سیاست کے میدان میں اتنے ہی لبرل مفکر اور رہنما تھے جتنا کہ کوئی کسی بھی مغربی جمہوریت میں ہوسکتا ہے۔ مہاتما گاندھی کا ہند سوراج کا فلسفہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہی راسخ ہو چکا تھا۔ ان کی نظر میں ہندوستان کی ساری برائیوں کا علاج سوراج میں تھا اور سوراج کو صرف عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے مشترک قومیت کے خیال سے پورا اتفاق کیا اور اپنی ساری زندگی مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ مسالمت کو پروان چڑھانے میں صرف کردی۔ ان کے نزدیک ہند سوراج کے معنی قطعاً ہندو راج کے نہ تھے بلکہ سوراج کے تحت سبھی کا درجہ برابر ہوگا اور سب فرقوں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا (ینگ انڈیا، 18/ستمبر 1924)۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا کہ ''کہا گیا ہے کہ سوراج اکثریت یعنی ہندوؤں کا راج ہوگا۔ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری غلطی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں اسے سوراج کہنے سے انکار کروں گا اور اپنی پوری قوت سے اس کا مقابلہ کروں گا کیوں کہ میرے نزدیک سوراج کے معنی تمام لوگوں کے راج کے ہیں۔ یہ انصاف کا راج ہوگا۔'' (ینگ انڈیا، 16/اپریل 1931)۔ اسی طرح انھوں نے کہا کہ ''سوراج کے دستور کے تحت ہر فرقہ ہر دوسرے فرقے سے درجے میں برابر ہوگا۔'' (ینگ انڈیا، 14/مئی 1931)

آزادی کے بعد انھوں نے کھل کر لکھا کہ ''اس ہندوستان میں جس کی تشکیل کے لیے میں نے ساری زندگی جدوجہد کی، ہر شخص اپنے مذہب سے قطع نظر مساوی درجہ کا حامل ہوگا۔ ریاست کو لازماً پوری طرح سیکولر ہونا ہے۔ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ ریاست کسی بھی مذہبی تعلیمی ادارے کی سرپرستی نہ کرے۔'' (ہریجن، 31/اگست 1947)۔ اسی طرح انھوں نے زور دے کر کہا کہ ''تمھیں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شہریوں جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ برابری کے برتاؤ کا تقاضا ہے کہ اردو رسم خط کا احترام کیا جائے۔'' (ہریجن، 26/اکتوبر 1947)۔ اسی طرح یہ تلقین کی کہ ''موجودہ فرقہ وارانہ منافرت کو دیکھتے ہوئے اردو رسم خط کے بائیکاٹ کو ایک جمہوریت مخالف عمل قرار دیا جانا چاہیے۔'' (ہریجن، 11/جنوری 1948)۔

تقسیم ہند کی ہولناکیوں کے باوجود انھوں نے کلکتہ میں 22/اگست 1947 کی اپنی تقریر میں کہا کہ "مذہب ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور اگر ہم اسے اپنے ذاتی دائرے تک محدود رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری سیاسی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔" (مجموعہ تصانیف گاندھی، جلد دوم، ص-267)۔ اسی طرح انھوں نے 17/دسمبر 1947 کو یوپی کے طلبہ کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ" اب جب کہ سوراج حاصل ہو چکا ہے ہم سب کو بھائی بہنوں کی طرح رہنا چاہیے۔ اب نہ کوئی ہندو ہو، نہ پارسی، نہ عیسائی نہ یہودی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم صرف ہندوستانی ہیں اور یہ کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے۔" (مجموعۂ تصانیف، جلد دوم، ص 68)۔ سب سے زیادہ جرأت مندانہ بیان انھوں نے یہ دیا کہ" میں تمام ہندوستانی مسلمانوں کو مظلوم نہیں قرار دیتا لیکن جو بات عیاں ہے وہ یہ کہ پاکستان کے جنم لینے کے بعد ہندوستانی مسلمان بہت ہی دشوار صورت حال سے دوچار ہیں۔ اب یہ اکثریتی فرقے کا فرض ہے کہ وہ ان کے ساتھ ٹھیک ٹھیک انصاف کرے۔ اس سے ہندو دھرم اور اکثریتی فرقے کی بربادی ہوگی اگر اکثریت اقتدار کے نشے میں یہ باور کرے کہ وہ اقلیتی فرقے کو کچل کر شدھ ہندو راج قائم کر سکتی ہے۔"

(ہریجن، یکم فروری-1948)

اس سے قبل انھوں نے لکھا کہ" مذہب و نسل سے قطع نظر مساوات کے بغیر آزادی کانگریس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کانگریس مذہبی راج کی تشکیل سے متنفر ہے۔ ہمارے نظریے کی ریاست کو سیکولر جمہوری ریاست ہونا ہے جس کے اندر ملک کے تمام فرقوں کے درمیان کامل آشتی ہو۔" (ہریجن، 16/نومبر-1947)۔

آزادی کے بعد ایک اہم سوال یہ درپیش ہوا کہ کیا سرکاری تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ اس بارے میں آزادی سے بہت پہلے 1937 ہی میں انھوں نے اپنی بنیادی تعلیم کی اسکیم میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ ابتدائی سطح پر صرف ان بنیادی اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی جائے گی جو سارے مذاہب میں مشترک ہیں لیکن کوئی ایسی تعلیم نہیں دی جائے گی جس سے طلبہ تنگ نظر اور متعصب ہوں۔ انھوں نے لکھا کہ" میں سرکاری مذہب کی ضرورت پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔ مذہبی معاملات میں ریاست کی مداخلت ہمیشہ نامنظور ہوگی۔ درحقیقت سماج میں اتنے ہی مذاہب ہیں جتنے اذہان۔ ہر ذہن میں خدا کا تصور دوسرے اذہان سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح میں سرکار کی جانب سے مذہبی اداروں کی جزوی یا کلی امداد کا مخالف ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ جو ادارہ یا گروہ اپنی مذہبی تعلیم کا مالی بندوبست نہیں کر سکتا وہ صحیح مذہب سے بیگانہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ سرکاری اسکولوں میں اخلاقی تعلیم نہ دی جائے۔ بنیادی اخلاقیات تمام مذاہب کے درمیان مشترک ہیں۔" (ہریجن 16/مارچ 1947)۔

اس کے کچھ دنوں بعد انھوں نے پھر لکھا کہ" میں نہیں سمجھتا کہ ریاست کو مذہبی تعلیم سے کوئی سروکار رکھنا چاہیے یا اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے کہ مذہبی تعلیم کا بندوبست مذہبی انجمنوں کی ذمے داری ہونا چاہیے۔ مذہب کو اخلاقیات سے گڈمڈ مت کرو۔ میرا عقیدہ ہے کہ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم بے شک سرکار کا فریضہ ہے۔ مذہب سے میری مراد بنیادی اخلاقیات سے نہیں بلکہ وہ سب کچھ ہے جو فرقہ وارانہ مسالک کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنی مذہبی تعلیم کے لیے سرکاری امداد کے محتاج ہیں وہ مذہب کے پیرو کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔" (ہریجن، 23مارچ 1947)

مختصر یہ کہ راجہ رام موہن رائے، سوامی دویکانند اور رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح مہاتما گاندھی نے بھی قدیم اور جدید کے مابین تطبیق کی وکالت کی۔ یہ پرانی نسل کے ان جیسے بزرگ، لبرل اور عقلیت پسند رہنماؤں کی تعلیمات کا فیض ہے کہ ہندوستان میں ایک سیکولر، جمہوری اور انصاف پسند دستور رائج ہوا اور یہاں سبھی فرقوں کو بنیادی حقوق اور آزادیاں میسر ہوئیں۔

Deptt. of Political Science, AMU, Aligarh

□□□

دیوانِ درد

مرتب: ڈاکٹر تسیم احمد

یہ خواجہ میر درد کے اردو دیوان کا تحقیقی ایڈیشن ہے جو ڈاکٹر تسیم احمد نے بڑی دیدہ ریزی سے دیوان درد کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے۔ حواشی میں مختلف نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور جس متن کو ترجیح دی گئی ہے، اس کی وجہ بھی دی گئی ہے۔ کتاب میں درد کے سوانحی کوائف اور ان کی دیگر تصنیفات کا تعارف بھی دیا گیا ہے، جن میں بعض نثری رسالوں کے علاوہ درد کا فارسی دیوان شامل ہے۔

صفحات: 336، قیمت: 160 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

انور ادیب

قرونِ وسطیٰ کے جغرافیہ داں

قرونِ وسطیٰ کے سائنس دانوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں زبردست ترقی کی تھی۔ جغرافیہ سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ان جغرافیہ دانوں نے اس زمانے میں بحری اور بری سفر کیے جبکہ سفری سہولیات معدوم اور راستے مسدود یا پرخطر تھے۔ اس طرح زبردست مصائب اور تکالیف کا سامنا کرتے ہوئے ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچتے تھے اور ذاتی مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر تحقیق کرنے کے بعد ان معلومات کو تحریر کرتے تھے۔ مسلم جغرافیہ دانوں کی تصانیف دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ تصانیف جو سفرناموں کی صورت میں لکھی گئیں۔ ان میں جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ تاریخی، ثقافتی اور ادبی امور کا ذکر ہے۔ دوسری وہ تصانیف ہیں جو خاص طور پر جغرافیہ کے موضوع پر لکھی گئیں، جن میں جغرافیہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نام **ہشام بن محمد الکلبی** کا ہے۔ انھیں پہلا مسلم جغرافیہ داں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ افسوس اس کی کتابیں ناپید ہیں۔ صرف وہ حصہ باقی بچا ہے، جس میں عرب کے جغرافیہ پر بحث کی گئی ہے۔

یعقوبی (متوفی 897) ایک مشہور جغرافیہ داں گزرے ہیں جو مصر کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور ایک طویل مدت تک سیاحت کی۔ وہ ہندوستان بھی آئے تھے۔ 891 میں انھوں نے ''کتاب البلدان'' لکھی۔ اس میں بغداد کی تفصیلات درج ہیں۔ ایران یونان اور اس خطے کا ذکر موجود ہے جسے آج افغانستان کہا جاتا ہے۔ اس میں کوفے، بغداد، وسطی اور جنوبی عرب، شام، مصر اور شمالی مغربی افریقہ وغیرہ کے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ چین اور ہندوستان سے متعلق حصہ دستیاب نہیں۔ ایران کی شاہراہوں کی مکمل تفصیلات بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں میں سب سے پہلے یعقوبی مغرب کی توجہ کا مرکز بنا اس لیے انھیں مسلم جغرافیہ کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔

مشہور سیاح اور جغرافیہ داں **ابودلف** 942 کے قریب ہندوستان آیا تھا۔ اس نے کابل سے مالابار تک کی سیاحت کی تھی۔ اس کی تصنیف ''عجائب البلدان'' سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بعد کے جغرافیہ دانوں نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی ایک مشہور مورخ اور جغرافیہ داں گزرا ہے جو بغداد میں پیدا ہوا۔ اس نے مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ وہ ہندوستان بھی آیا تھا اور سندھ، پنجاب اور مالابار کی سیاحت کرتا ہوا سری لنکا پہنچا۔ وہاں سے زنجبار اور مڈغاسکر ہوتا ہوا عمان چلا گیا۔ اس نے ایشیائے کوچک، شام اور فلسطین کے علاقوں کی بھی سیر کی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ مصر پہنچا جہاں 956 میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ''روح الذہب و معادن الجواہر'' مسعودی کے سفری مشاہدات اور تجربات پر مشتمل دستاویز ہے جو بیش قیمت جغرافیائی معلومات کی حامل ہے۔

المقدسی بھی مشہور جغرافیہ داں تھا جسے مغرب میں زبردست شہرت ملی۔ وہ فلسطین کا باشندہ تھا اور یروشلم میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہسپانیہ اور ہندوستان کے علاوہ تمام مسلم دنیا کا سفر کیا تھا۔ 985 میں اس نے ''احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقلیم'' تصنیف کی۔ اس نے کل عرب دنیا کو چودہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر طبقے کے لیے ایک علاحدہ نقشہ بنایا ہے۔ اس کی تصنیف کے دو نسخے موجود ہیں ایک قسطنطنیہ میں اور دوسرا برلن میں۔

ابوریحان البیرونی بیک وقت سائنس داں، مورخ، ماہر طبقات الارض و معدنیات، جغرافیہ داں اور ریاضی داں غرض کہ علوم متداولہ کا ماہر تھا۔ اس کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ 972 میں خوارزم کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار سے منسلک ہونے سے قبل یعنی 1017 سے قبل اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ البیرونی نے متعدد بار ہندوستان کا سفر کیا۔ یہاں اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندو تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا۔ تقریباً اسّی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کے بارے میں اس نے معرکتہ الآرا تصنیف ''کتاب الہند'' لکھی۔ اس کے مطالعے کی گہرائی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے میدانی علاقے کے وجود میں آنے سے متعلق مسئلے کی تشریح کی ہے۔ اس کے طبعی جغرافیہ پر بھی اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایشیا اور یورپ کا جغرافیہ بیان کرنے کے دوران اس نے ہمالیہ سے آلپس (ALps) تک کے پہاڑی سلسلے کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیہ کے بارے میں جو تفصیلات البیرونی نے پیش کی ہیں وہ اس ملک کے سرحدی علاقے میں اس کی طبعی ساخت، بارش سے متعلق معلومات، نیز یہاں کے

مویشیوں اور پیڑ پودے کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہیں۔ البیرونی نے مدوجزر کے واقعے کی وضاحت بہتر انداز میں کی ہے۔

ناصر خسرو ایک ایرانی سیاح تھا۔ اس نے فلسطین، عرب اور ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ ''سفرنامۂ ناصر خسرو'' 1045 میں ایران میں لکھا گیا جس میں ان ممالک کے بارے میں جغرافیائی معلومات ملتی ہیں جہاں کی سیاحت ناصر خسرو نے کی تھی۔

البکری (1040-1094) قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا۔ اس نے ایک جغرافیائی ڈائری اور کتاب تصنیف کی۔ اس کے ماخذوں میں ایک ہسپانوی جغرافیہ داں محمد الطارقی (متوفی 973) کا نام بھی ہے جس نے شمالی افریقہ کے جغرافیائی حالات قلم بند کیے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں جغرافیہ دانوں نے مل کر ایک کتاب مرتب کی تھی مگر اس کے چند اوراق ہی دستیاب ہیں۔ جو پیرس میں موجود ہیں۔

الحویتی (1080-1169) غرناطہ میں پیدا ہوا اور مصر، بغداد و خراسان وغیرہ کا سفر کیا۔ اس نے جغرافیہ کے موضوع پر چار کتابیں تصنیف کیں جن میں ''تحفۃ الالباب'' اس کے سفر کی تفصیلات پر مبنی ہے۔

الادریسی (1099-1164) اندلس (ہسپانیہ) کے مشہور شہر ''سبتہ'' میں پیدا ہوا اور قرطبہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے یورپ کا سفر کیا اور طویل عرصے تک سسلی کے عیسائی حکمراں روجرس دوئم کے دربار سے وابستہ رہا۔ سسلی میں قیام کے دوران اس نے بادشاہ روجرس دوئم کی خواہش پر جغرافیہ کی نہایت جامع اور مفید کتاب تیار کی جس کا نام ''نزہتہ المشتاق فی احتراق الآفاق'' ہے۔ یہ علم جغرافیہ پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنی جملہ تحقیقات اور جغرافیائی معلومات نہایت عمدہ ترتیب سے جمع کر دی ہیں۔ ہر جگہ نقشے بھی دیے ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں اس نے پندرہ سال صرف کیے۔ یورپ والوں نے اس کتاب کو بنیاد بنایا اور نقشہ نویسی شروع کی۔ ایک طویل عرصے تک یہ یورپ میں جغرافیہ کی سب سے اہم کتاب سمجھی جاتی رہی۔

ادریسی نے ایک دوسری کتاب بھی لکھی جس کا نام ''روض الانس و نزہتہ النفس'' ہے یہ کتاب بھی بیش بہا جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہے۔

ادریسی ایک جدت پسند دماغ کا مالک تھا۔ اس نے دنیا کا ایک گول ماڈل بنایا جو چاندی سے تیار کیا گیا تھا۔ اس ماڈل میں دنیا کے ممالک دکھائے گئے تھے۔ دنیا کا یہ پہلا ماڈل تھا۔ اس نے اپنی کتاب اور دنیا کا ماڈل روجرس دوئم کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ادریسی کو انعام و اکرام سے نوازا۔

یاقوت حموی (1229-1197) کا شمار عظیم جغرافیہ دانوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ یونانی نژاد تھا۔ اس نے مختلف ملکوں مثلاً ایران، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا۔ اس کی مشہور تصنیف ''معجم البلدان'' ہے جو اس نے 1224 میں مکمل کی جس کے پانچ سال بعد 1229 میں اس کا انتقال ہوا۔ ''معجم البلدان کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس ڈائرکٹری میں ان شہروں اور مقامات کے بارے میں معلومات جمع ہیں جو یاقوت کو حاصل ہوئیں۔ اس میں تیرھویں صدی عیسوی کے مسلم ممالک کے علاوہ ہندوستان سے متعلق جغرافیائی معلومات درج ہیں۔

قزوینی (1282-1203) اصل نام زکریا بن محمد قزوینی تھا۔ وہ قزوین کا رہنے والا تھا جو خلیفہ ہارون رشید کا آباد کیا ہوا ایک مشہور شہر تھا۔ اسے علم جغرافیہ سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس نے دس سال سفر اور سیاحت میں گزارے۔ ایران، خراسان، افغانستان، ترکی، خوارزم، آرمینیا، آذر بائجان وغیرہ کی سیاحت کی۔ دس سال بعد وہ بغداد واپس آیا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ پندرہ سال کی سخت کاوش اور عرق ریزی کے بعد اس کی مایۂ ناز کتاب ''عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات'' مکمل ہوئی جو جدید معلومات کی بنا پر عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئی اور زبردست شہرت حاصل کی۔ اس کتاب اور چیزوں کے علاوہ مشہور پہاڑوں، سمندروں، ندیوں، جزیروں اور آبشاروں کا بیان ہے۔ اس کی دوسری مشہور کتابوں میں ''عجائب البلدان''، ''صورۃ الارض''، ''آثار البلاد''، ''اخبار العباد'' ہیں جو تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے زبردست اہمیت کی حامل ہیں۔

قزوینی نے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ زمین اپنے محور پر سورج کے گرد گھوم رہی ہے اور اسی سے موسم میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ چاند، زمین اور سورج کے گرد گھوم رہا ہے اور زمین و چاند سورج کے گرد گھوم رہے ہیں ان کے علاوہ سورج بھی گھوم رہا ہے۔ وہ ساکت نہیں ہے۔

80 سال کی عمر میں 1282 میں اس عظیم جغرافیہ داں کا انتقال ہوا۔ قزوینی کی متعدد کتابوں کا ترجمہ یورپی زبانوں میں ہوا۔ یورپ کے علما اور دانشوروں نے قزوینی کو 1972 میں لندن کے ایک سیمینار میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ آج بھی قزوینی کے باتصویر مخطوطات میونخ، واشنگٹن، پیرس اور ہندوستان میں محفوظ ہیں۔

Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla,
Railpar, Asansol-713302 (W.B.)

□□□

مدحت لقمان

صنعت وحرفت

ہر شخص اپنی خواہش، اہلیت اور وسائل کے مطابق اپنے لیے ذرائع معاش کا انتخاب کرتا ہے۔ ان ذرائع میں صنعت وحرفت بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس میدان میں قدم رکھنے سے قبل درج ذیل نکات پر غور وفکر لازمی ہے اور ان پر عمل پیرا ہوکر بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

صنعت کس چیز کو بنانے کے لیے لگائی جائے۔

صنعت کے ذریعے کتنی سالانہ آمدنی کا نشانہ (Target) رکھنا ہے۔

طے کیے نشانے کو حاصل کرنے کے لیے کتنا پیسہ درکار ہے۔

کیا حسب ضرورت سرمایہ موجود ہے یا اس کی فراہمی کے لیے مالی امداد کی ضرورت ہے۔

صنعت سے خاطر خواہ نتائج نہ نکلنے پر کیا نقصان برداشت کرنے کی قوت ہے۔

زمین، مکان، شیڈ، آمدورفت کی آسانی، پانی اور بجلی جیسی ضروریات زندگی بہ آسانی فراہم ہیں۔

متعلقہ صنعت سے وابستہ قانونی وانتظامی دشواریوں کو حل کرنا لازمی ہے۔

اگر کسی بڑی کمپنی کے وینڈر (Vendor) کی حیثیت سے صنعت لگانا ہے تو مناسب شرائط طے ہونی چاہئیں۔

اگر بازار کے لیے کوئی چیز (Product) بنانا ہے تو کیا بازار میں اس کی مانگ ہے۔

چیز کی قیمت بننے پر کیا ہوگی اور خریدنے والا کتنی قیمت دے سکے گا اور اس سے جو بچت ہونے والی ہے اس سے سالانہ آمدنی کا نشانہ پورا ہوسکے گا یا نہیں۔

اس پر بھی غور کیا جائے کہ فروخت کے انتظامات پر کتنے اخراجات متوقع ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی نکات ہوسکتے ہیں جن پر توجہ دی جاسکتی ہے۔

صنعت کس چیز کی لگائی جائے

صنعت اس چیز کی لگائی چاہیے جس کے بنانے کے طریقۂ کار سے واقفیت ہو۔ بازار میں بیچنے کے لیے اگر کوئی چیز (Product) بنانا ہے تو یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ مارکیٹ میں کس سامان کی کھپت کے اچھے امکانات ہیں۔ اس کے لیے یا تو بازار کا سروے (Market Survey) کیا جائے یا ضلع کے صنعتی مرکز سے معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی معلومات فراہم کرنے کے دوران کئی چیزیں سامنے آسکتی ہیں اس وقت یہ فیصلہ کرنا زیادہ اہم ہوگا کہ کون سی چیزیں بنائی جائیں اور کون سی نہیں۔

صنعت اگر کسی بڑی کمپنی کا سامان یا پرزے بنانے کے لیے لگائی ہے تو نسبتاً یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا چونکہ پرزے سے متعلق جملہ معلومات فراہم ہو سکیں گی اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ایک مہینے یا ایک سال میں ان پرزوں کی کتنی کھپت ہے۔

سالانہ آمدنی

مثال کے طور پر سالانہ آمدنی 12 لاکھ، 50 لاکھ یا ایک کروڑ کی ہوسکتی ہے۔ یہ صنعت کار (Enterpreneur) کو خود محسوس کرنا ہوگا کہ وہ کتنی آمدنی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کے پاس کتنے مواصلات ہیں۔ اگر کسی کمپنی کے لیے کام کیا جاتا ہے تو کمپنی سے مذاکرات کرکے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سالانہ آمدنی کتنی ہوسکتی ہے۔ اگر سامان کو بازار میں بیچنا ہے تو سالانہ آمدنی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے اور اس میں کافی کمی بیشی کے امکانات ہیں۔

سرمائے کی ضرورت

مانا کہ 12 لاکھ روپئے سالانہ آمدنی کا منصوبہ (Target) ہے، تو اس منصوبے کو حاصل کرنے کے لیے کتنا سرمایہ لگانا ہے؟ اس کا تخمینہ لگانے کے لیے ایک پروجیکٹ رپورٹ (Project Report) تیار کرنی ہوگی۔ کچے مال کی قیمت، مشینری کی قیمت، پوری صنعت کو لگانے میں لاگت، مستقبل کے اخراجات، کم اور زیادہ ہونے والے اخراجات وغیرہ کا حساب لگانا ہوگا۔ اس کے لیے اشیا کو بنانے کی (Manufacturing Process) مکمل معلومات لازمی ہے۔ چونکہ اسی بنیاد پر تو حساب لگایا جاسکتا ہے کہ مشینوں کی تعداد کیا ہوگی، کتنے مزدور درکار ہوں گے، علاوہ ازیں بجلی، پانی وغیرہ کا حساب۔

سرمائے کی فراہمی اور اس کے طریقۂ استعمال کے بارے میں صحیح معلومات اور رہبری کے لیے کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ وغیرہ سے رابطہ ضروری ہے۔

مقام

چھوٹی گھریلو قسم کی صنعتیں کسی بھی چھوٹی جگہ میں لگائی جاسکتی ہیں۔ لیکن بڑی صنعتیں رہائشی علاقوں میں لگانا غیر مناسب ہے۔ مشینوں کی آواز اور دیگر قسم کی آلودگی کے سبب رہائشی علاقوں میں ضلع انتظامیہ کی جانب سے اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ ایسی صنعتوں کو لگانے کے لیے یا تو شہر سے باہر یا صنعتی اسٹیٹس (Industrial Estates) میں جانا پڑتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوتا ہے کہ صنعتی مرکز میں اپنی صنعت کو لگانے کے لیے نامزد کروائیں اور جگہ حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جائے تاکہ مستقبل میں کوئی دشواری پیش نہ آسکے۔

صنعت کار نے جس سامان (Product) کو بنانے کا منصوبہ بنایا ہے اگر وہ کئی پرزوں کو جوڑ کر تیار ہونے والا ہے تو ایسی صورت میں کچھ پرزے دیگر چھوٹے کارخانوں سے بنوا سکتے ہیں اور اپنے کارخانے میں ان کی Assembling اور پیکنگ وغیرہ کرسکتے ہیں۔ اس طرح صنعت کار کو اپنے کارخانے میں کم مزدوروں کی ضرورت پڑے گی۔ یہ ایک فائدے کا عمل ہوسکتا ہے، لیکن اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

کمپیوٹر کا استعمال

اب چھوٹے صنعت کاروں کے لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ اپنے سامان، اخراجات، سامان کی تیاری، فراہمی کا صحیح صحیح رکارڈ رکھیں۔ آج کل یہ کام آسان ہوگیا ہے۔ کمپیوٹر میں MS. Excel پروگرام اس سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کمپنیوں سے فوراً ہی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے جس سے ضروری معلومات بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

دوراندیشی

صنعت کار کو اپنا ایک نشانہ طے کرنا چاہیے۔ اسی کے مطابق عمل پیرا ہوکر اپنے مقصد تک بہ آسانی پہنچا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ آس پاس کے حالات، ملک کے حالات، سیاسی تبدیلیاں، قوانین وضوابط میں تبدیلیاں اور صنعتی مسابقت پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے اس کے لیے اخبار پڑھیں، ریڈیو پر خبریں سنیں اور ٹیلی ویژن سے استفادہ کریں۔ اس پیشے سے وابستہ دیگر افراد سے بھی تبادلۂ خیالات کرتے رہیں تاکہ ان کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکے۔

EWS-109/4 ADA Colony,
Neem Sarai,
Allahabad-211011

□□□

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی.آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت: -/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

حکیم اشہر قدیر

بخار ــــ فصل خریف کی عام بیماری

موسموں کی تبدیلی بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر انسانی صحت کو متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا علم طب میں ''فصول اربع'' کے عنوان سے باقاعدہ موسموں کے مزاج اور ان میں لاحق ہونے والے امراض پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ایک سال کو چار موسموں فصل صیف، فصل خریف، فصل شتا اور فصل ربیع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انسانی صحت کے لیے فصل ربیع کو بہترین اور فصل خریف کو بدترین موسم قرار دیا گیا ہے۔

ہندوستانی جغرافیہ اور آب و ہوا کے تناظر میں جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینے فصل خریف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب شدید گرمی کے بعد بارش کے نتیجے میں موسم کا مزاج گرم و خشک سے تبدیل ہوکر گرم وتر ہوجاتا ہے۔ اس موسم میں درجۂ حرارت کا 37 ڈگری سینٹی گریڈ سے زائد رہنا اور ہوا میں آبی بخارات کی کثرت (Humidity) نیز ہوا کا دباؤ بڑھنے سے ایک حبس کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے جس میں انسان کو گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ یہی نہیں گرمی کی وجہ سے بکثرت پسینہ آنا اور اس کے خشک نہ ہونے سے انسان پریشان ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں بدن کی حرارت میں کمی لانے کی غرض سے دوران خون درون بدن سے بیرونی جانب مائل ہوجاتا ہے اور اندرونی احشا میں خون کی کمی کے باعث نظام ہضم و استحالہ متاثر ہوتا ہے۔ بھوک کم لگتی ہے اور پسینے کثرت کی وجہ سے پیاس کی شدت بڑھ جاتی ہے اور انسان پانی زیادہ پیتا ہے۔ بھوک میں کمی اور گرمی سے اذیت پہنچنے کے باعث قوئ مضمحل ہوجاتے ہیں اور طبیعت نڈھال ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی مرض بآسانی بدن پر حملہ کرسکتا ہے۔

ایک طرف طبیعت کے نڈھال ہونے سے بدن کی قوت مدافعت میں کمی اور دوسری طرف گرم موسم اور مرطوب ہوا کے نتیجے میں امراض پیدا کرنے والے جراثیم کی کثرت سے فصل خریف میں زیادہ امراض لاحق ہوتے ہیں۔

کسی بھی ذی حیات کی نشو ونما کے لیے ماحول میں حرارت اور رطوبت درکار ہوتی ہے اور چونکہ فصل خریف میں یہ شرائط پوری ہوجاتی ہیں اس لیے جراثیم بھی اس موسم میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور مختلف ذرائع سے انسان کے بدن سے اتصال پاکر مختلف امراض کا سبب بنتے ہیں۔ جراثیم سے پیدا ہونے والے امراض کو ''امراض متعدیہ'' (Infectious diseases) کہتے ہیں اور بخار امراض متعدیہ کی خاص علامات میں سے ہے۔

یوں تو فصل خریف میں طرح طرح کے انفیکشن اور بخار سامنے آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ بھرمار وائرس کے تعدیہ سے ہونے والے بخاروں کی ہوتی ہے جن کو Viral Fever کہتے ہیں۔ وائرس زیادہ تر ہوا کے ذریعے آنکھ، ناک اور گلے کے راستے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور آشوب چشم، نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور درد جیسے امراض پیدا کرتے ہیں۔ ان تکالیف کے چند گھنٹے بعد بہت ممکن ہے کہ مریض کو تیز بخار ہوجائے جو 104F سے 105F تک تجاوز کرسکتا ہے۔

وائرس سے پیدا ہونے والے بخار وبا کی شکل بھی اختیار کرلیتے ہیں اور ہر گھر میں بخار کے ایک یا دو مریض مل جاتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس موسم میں ہر شخص اس وبا سے محتاط اور باخبر رہے اور بخار کا شکار ہونے سے قبل کچھ تحفظی تدابیر اپنائے۔ جیسے صبح سے شام تک کم از کم تین بار صابن سے اچھی طرح ہاتھ اور منہ دھوئے۔ آنکھ، ناک اور گلے میں پانی پہنچا کر اچھی طرح صاف کرے۔ دن میں کم از کم ایک بار ضرور نہائے۔ اپنا تولیہ اور رومال علاحدہ رکھے، دوسرے کا استعمال شدہ کوئی کپڑا استعمال نہ کرے۔ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھے تاکہ تازہ ہوا کا گزر ہو اور گندی اور کثیف ہوا گھر سے باہر نکل سکے۔ گھر سے باہر نکل کر بھیڑ بھاڑ والی جگہوں سے جہاں تک ممکن ہو، بچنا چاہیے۔ راستے میں جہاں بھیڑ زیادہ ہو یا ہوا میں بدبو محسوس ہو، ناک اور منہ پر کپڑا رکھ لے اور اگر کوئی انسان بخار کا شکار ہو ہی گیا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ایسی جگہوں پر نہ جائے جہاں دوسرے لوگوں کے اتصال میں آکر وہ وبا کو پھیلانے کا سبب بنے۔ اس موسم میں بچوں کی حفاظت بہت ضروری ہے وہ وائرس سے بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں۔ بچوں کو ہونے والی خسرا نامی بیماری بھی ایک وائرس کے نتیجے میں ہوتی ہے اور فصل خریف میں اس میں کثرت آجاتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ بچوں کو ٹیکے (Vaccination) لگائے جائیں تاکہ وہ متعدی بیماریوں سے دور رہیں۔ جب گھر کا کوئی بڑا بیمار ہوجاتا ہے تو وہ ڈاکٹر کو دکھانے جاتے وقت اپنے ساتھ چھوٹے بچے کو بھی لے جاتا ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہیے، بچوں کو بلاسبب اسپتال یا ڈاکٹر کے کلینک پر نہیں لے جانا چاہیے۔ وہاں بچے کسی بیماری میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ بچوں کو زیادہ تر وائرس کا انفیکشن اسکول سے لگتا ہے جہاں ایک بیمار بچہ کئی اور بچوں تک بیماری پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے بہت

ضروری ہے کہ بیمار بچے کو اسکول نہ بھیجا جائے۔ اس سلسلے میں اسکول کے منتظمین کو چاہیے کہ اگر کوئی بچہ نزلہ، کھانسی، بخار یا آنکھوں کی سرخی میں مبتلا ہے تو اس کو صحت یاب ہونے تک چھٹی دے دیں۔

وائرس سے پیداشدہ بخار کے علاج کے سلسلے میں بھی کچھ باتیں اہم ہیں۔ یہ بخار بہت جلد شدت اختیار کرلیتا ہے اور مریض کا بدن بخار سے جلنے لگتا ہے۔ اگر تھرمامیٹر سے معلوم ہو کہ بخار 103F سے تجاوز کر چکا ہے تو فوراً مریض کی پیشانی، ہاتھ اور پیروں پر پانی میں تر کی گئی کپڑے کی پٹیاں رکھیں اور انھیں وقفے وقفے سے بدلتے رہیں۔ اس سے بخار کی شدت کو کم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے بعد مریض کو دافع بخار دوائیں دینی چاہئیں تاکہ بخار کم ہوجائے۔ یہ بخار چار سے پانچ دن رہنے کے بعد از خود ٹھیک ہوجاتا ہے۔ اس دوران مریض کے لیے لازم ہے کہ وہ بستر پر آرام کرے۔ ہلکی غذائیں کھائے اور دوسروں سے قدرے دور رہے۔ لیکن اگر بخار کے ساتھ ساتھ شدید کھانسی، سینے میں درد اور سانس لینے میں تکلیف کا احساس ہو تو فوراً کسی مستند طبیب سے رجوع کرنا ضروری ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وائرس کے ساتھ کسی جرثومہ (بیکٹیریا) نے انفیکشن میں شراکت کرلی ہو جس کے علاج کے لیے مخصوص ادویہ درکار ہوتی ہیں جو ایک معالج ہی تجویز کرسکتا ہے۔

اگر بخار آٹھ یا نو دن سے زائد مدت تک قائم رہے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ بخار کا سبب اور نوعیت کچھ مختلف ہے۔ فصل خریف میں مکھی اور مچھر کی بھی کثرت ہوتی ہے اور کھانے پینے کی اشیا میں برسات کی وجہ سے گندگی ہوسکتی ہے چنانچہ ملیریا، ٹائفائڈ اور کالازار جیسے موذی امراض بھی اس موسم میں سراٹھاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مریض کے خون کی جانچ ہو تاکہ بخار کی صحیح نوعیت جان کر درست علاج کیا جاسکے۔ حالانکہ صفائی ہر وقت اور ہر موسم میں بیماریوں سے دور رکھنے میں مدد کرتی ہے لیکن برسات کے موسم میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ گلی کوچوں میں پانی بھر جانے اور اس میں کوڑا کرکٹ مل جانے سے ایسا ماحول بن جاتا ہے جس میں مرض کے اسباب نشوونما پاتے ہیں۔ اس لیے ہم سب کا یہ فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگلی، محلوں کو صاف رکھیں۔ کوڑا وغیرہ عام گزرگاہوں میں نہ ڈالیں۔ نالیوں کی صفائی پر توجہ دیں اور ہوسکے تو راستوں اور کوڑا دان کے آس پاس چونا، مٹی کا تیل وغیرہ چھڑکتے رہیں۔ ان تدابیر سے جراثیم کو ماحول پراگندہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور صحت مند فضا ہموار ہوسکے گی۔

157/A, Ghaffar Manzil, Jamia Nagar, New Delhi-25

❑❑❑

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صاحب کتاب کی صلاحیتوں کی داد ان لفظوں میں دی ہے— "ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کرلیا ہے اور وہ اس میں محض نقال یا خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہلِ زبان کے شریک اور اہلِ ذوق کے ہمنفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساس ذمہ داری بھی اور ایک صاحب ذوق کا انبساط و استغراق بھی۔"

صفحات: 352، قیمت: -/86 روپے

قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ (جلد اوّل۔ عربی)

مصنف: کاوش بدری

جنوبی ہند میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔
اس کتاب میں تمل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
نیز وہاں کے اہم علما کا تعارف، کتب خانوں اور نادر مخطوطات کی تفصیلات،
اہم عربی مدارس اور عصرِ حاضر میں عربی تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 176، قیمت: -/98 روپے

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

"شریمد بھگوت گیتا" ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے— ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کردیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کردی گئی ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

یونانی ادویۂ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بہتر تشخیص کرلے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 334 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف فواکہات اور میوہ جات سے لے کر انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت -/70 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

مغل سلطنت کا قیام

شمال کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کرنے والے حوصلہ مند جانبازوں کی تمام فوجی کارروائیوں میں بابر کے حملے کے اثرات سب سے زیادہ گہرے اور دیرپا تھے۔ وہ بولان درے (Bolan pass) کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ یہ وہی راستہ تھا جو اس سے تقریباً سترہ سو برس قبل سکندر اعظم نے اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ سکندر کو سلطنت ورثے میں ملی تھی۔ اپنے والد کے زیرِ سایہ جنگ وجدل میں تربیت یافتہ، سکندر کو محض اس کی توسیع کرنی تھی۔ بابر کا معاملہ مختلف تھا۔ حالانکہ وہ فرغانہ کی ایک چھوٹی ریاست کا جواب ترکستان میں ہے، وارث تھا، مگر بابر کو جو ابھی اپنے عنوانِ شباب کو بھی نہیں پہنچا تھا، اسے برقرار رکھنے کے لیے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بابر کی طاقت بہت کم تھی۔ اس کے کارناموں نے بابر کو ہر دلعزیز اور انسان دوست بنا دیا۔

سکندر اعظم بادشاہوں میں ایک بادشاہ تھا، بابر انسانوں کے درمیان ایک بادشاہ اور بادشاہوں میں ایک انسان تھا، ایک عملی انسان، گہرے احساسات کا ایک شاعر، جو فارسی اور ترکی زبانوں سے اشعار کا حوالہ دیتا تھا اور مشاہدے میں آنے والی کسی چیز کو بیان کرنے میں یا اتفاقاً سننے والے کسی واقعے کو نہایت جامع الفاظ کے ساتھ دہرانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اپنی خودنوشت ''تزکِ بابری'' میں وہ ہمیں دوسرے بادشاہوں کے برعکس، ایک انفرادی خصوصیت کا شخص نظر آتا ہے۔ وہ ایک شاعر، ایک ہمہ گیر نثر نگار، آرٹ کا ایک عظیم مربی اور ایک نہایت عملی انسان تھا، جس نے اپنے مثالی اعمال سے اس ملک پر گہرا اثر چھوڑا جسے اس نے فتح کیا تھا۔

اس چغتائی ترک نے جس کی رگوں میں باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی جانب سے چنگیز خاں کا خون گردش کر رہا تھا، 1483 میں جنم لیا تھا۔ جب وہ محض بارہ برس کا تھا اس نے فرغانہ کی سلطنت پر اپنے باپ کی جانشینی اختیار کی اور سبھی جانب سے حریص دشمنوں میں گھر گیا۔ اسے اپنے چچا کی کوششوں کو بھی شکست دینا تھا جو اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اصل تعلیم میدان جنگ میں ہوئی تھی۔

بابر ایک بے پناہ طاقتور انسان، ایک ماہر شمشیر زن، گھوڑ سوار اور تیرانداز کی طرح پروان چڑھا۔ وہ اپنے دادا تیمور کے عظیم دار الحکومت، سمرقند کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا اور 1497 کے آخر میں اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مسرت بخش باغ دلکشا میں قیام کیا جس کی دیواروں پر تیمور کے عظیم کارناموں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ بابر یہاں زیادہ دنوں تک نہیں رکا۔ اس کی بیماری سے یہ افواہ عام ہوگئی کہ بابر اب نہیں رہا۔ اس طرح، اس کے معتقدین ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے اور بابر کو کچھ دن بیابان میں گزارنے پڑے۔ لیکن اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کی دوبارہ کوشش کی۔ یہ مرحلہ بہت دشوار تھا اور اس کے پیروؤں کو کتوں کے گوشت پر اور گھوڑوں کو شہتوت کے پتوں پر گزارا کرنا پڑا۔ دوبارہ بیاباں گردی کی حالت میں اس نے 111 برس کی ایک عورت کے گھر میں پناہ لی جس نے اسے ہندوستان میں تیمور کے عظیم کارناموں کی کہانیاں سنائیں، وہ کہانیاں جنھوں نے اس کے خیالات کو روشن کر دیا۔

شطرنج کے بادشاہ کی طرح ادھر ادھر بھٹکنے سے عاجز آکر اس نے تقریباً دو سو لوگوں کو جمع کیا اور کابل پر حملہ کر دیا جو اس کے دعوے کے مطابق اس کے ذاتی علاقے کا حصہ تھا، اور اس کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ بابر کے مطابق ''میرے ساتھیوں کا ایک بڑا حصہ پیادہ پا تھا جن کے پیروں میں موٹے جوتے اور ہاتھوں میں ڈنڈے تھے اور ان کے شانوں پر لمبی قبائیں تھیں۔ ان کی تنگدستی کا یہ حال تھا کہ ہم سب کے مابین صرف دو خیمے تھے۔ خود میرا اپنا خیمہ میری ماں کے لیے نصب کیا گیا تھا۔''

کابل کو 1504 میں تسخیر کر لیا گیا۔ بابر کی یہ فتح بہت حد تک اس کی قائدانہ صلاحیتوں کی مرہونِ منت تھی۔ اس کے فوجی اس کے لیے اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار تھے۔ ایک موقعے پر وہ اور اس کے ساتھی ہرات اور کابل کے درمیان شدید برفباری میں پھنس گئے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ ایک غار میں پناہ لے سکتا ہے۔ اس پر بابر نے کہا ''میرے لیے ایک گرم پناہ گاہ میں آرام سے رہنا، جبکہ میرے آدمی برف میں پھنسے ہوں، میرے

"Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔

لیے اندر نیند اور آرام کا مزا لینا جبکہ میرے ساتھی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہوں، یہ میرے تئیں ان کے احسانات کے ناموافق ہوگا۔ تو میں برف اور ہوا کے درمیان ایک گڑھے میں بیٹھا رہا جسے میں نے کھودا تھا اور برف میری پشت، سر اور کانوں پر گرتی رہی۔''

کابل ہندوستان کی گزرگاہ تھا جدھر سے ہندوستانی قافلے کپڑوں، شکر، مسالے اور لونگ سے لدے ہوئے آتے تھے۔ بابر نے ہندوستان پر حملے کا منصوبہ تیار کیا۔ کئی برسوں کی تیاری کے بعد، جس کے دوران اس نے اپنے فوجیوں کو آمادہ کیا، وہ ہندوستان کی مہم کے لیے نکلا۔ یہ 1519 کا واقعہ ہے۔ وہ بھیرہ (Bhera) پہنچا اور تاوان وصول کیا۔ اس نے سندھ کو عبور کیا اور ابراہیم لودھی کے پاس ایلچی بھیجے جس نے پنجاب کے بعض اضلاع اس کے حوالے کردیے۔ اگلے سال وہ پھر آیا اور سیالکوٹ تک پیش قدمی کی مگر قندھار میں ایک تشویشناک صورت حال کی بنا پر واپس لوٹ گیا۔ کل ملا کر سات برسوں میں اس نے پانچ بار حملے کیے جن میں چار پنجاب پر تھے۔

وہ اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے: ''ہندوستان پر قبضہ کرنا ہمیشہ سے میری دلی تمنا تھی، اور چونکہ یہ خطے کبھی ترکوں کے قبضے میں رہ چکے تھے، میں انھیں اپنی ملکیت تصور کرتا تھا اور انھیں اپنے ہاتھوں میں لینے کا ارادہ کرچکا تھا خواہ پرامن طریقے سے یا طاقت کے زور پر۔'' اس نے ایک سرکاری اعلان جاری کیا جس میں ہندوستانی لوگوں سے کہا گیا کہ اگرچہ اس کی نظریں ان کی زمین پر ہیں لیکن ''اچانک حملہ اور تاراجی نہیں کی جائے گی۔''

بابر نے میدان سازگار بنانے کے لیے اپنے کارندوں کو بھیجا۔ پنجاب پر کیے گئے حملوں سے اسے ان مسائل کا اندازہ ہوگیا تھا جو اسے پیش آنے والے تھے اور ان سے اس بات کا بھی اسے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ مقامی لوگوں کو کس طرح قابو میں کیا جاسکتا تھا۔

جب پنجاب کے مسلم گورنر، دولت خاں لودھی نے بابر کو کابل سے آنے اور دہلی کے تخت پر سلطان ابراہیم لودھی کی جگہ اپنے چچا عالم خاں کو بٹھانے میں مدد کرنے کی دعوت دی تو اس نے دیکھا کہ افغان سردار اس مسئلے پر بٹے ہوئے تھے۔ بابر لکھتا ہے ''17 نومبر 1525 کو ہندوستان پر حملے کی غرض سے میں نے کوچ کیا۔'' اس نے ابراہیم لودھی کی فوجوں کو لاہور سے نکال باہر کیا، دیپل پور پر قبضہ کیا اور دولت خاں کو نظرانداز کرکے کابل لوٹ گیا۔ وہ اس کی فوجوں کا سامنا کرنے کے لیے دوبارہ آیا اور اسے شکست دی۔

دولت خاں کو برطرف کردیا گیا، اس کی جاگیر ضبط کرلی گئی اور اسے اور اس کے اہل خانہ کو اس کے آبائی وطن میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ اور پھر بابر نے کہا، ''میں نے حوصلے کی رکاب میں اپنے قدم رکھ دیے ہیں اور میرے ہاتھ خدا پر اعتماد کی باگ پر ہیں۔'' اور سلطان ابراہیم کی طرف کوچ کیا۔ لودھی افغان جس کے قبضے میں اس وقت دہلی کا پایۂ تخت اور ہندوستان کی علمداری تھی، کہا جاتا تھا کہ میدان میں اس کی فوجوں کی تعداد ایک لاکھ آدمیوں پر مشتمل تھی اور اس کے پاس اس کے امیروں کو ملا کر ایک ہزار ہاتھی تھے۔

حملہ آور کو پسپا کرنے کے خیال سے ابراہیم لودھی نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مغرب کی طرف کوچ کیا۔ بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں آمنے سامنے ہوئیں۔ لودھی کے ہاتھیوں کے مقابلے میں بابر کے پاس بندوق برداروں کا ایک تربیت یافتہ دستہ اور ایک ترکی افسر کی ماتحتی میں توپ خانہ موجود تھا۔ اس کی جنگی چالوں اور منصوبوں نے دشمن پر چاروں طرف سے حملہ کرکے انھیں گھیرے میں لے لیا اور پھر ان پر آتشی ہتھیاروں اور گھوڑ سواروں اور توپوں سے حملہ کیا گیا جس سے ان میں بدحواسی اور افراتفری پھیل گئی۔

21 اپریل 1526 کو دشمن کو زچ کرتے ہوئے، بابر نے ابراہیم لودھی کو خود پر حملہ کرنے پر مجبور کیا اور پھر آتشی ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ لودھی کی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی، سلطان خود بھی میدان جنگ میں مارا گیا۔ بابر لکھتا ہے، ''خدا کی مہربانی سے یہ دشوار مرحلہ میرے لیے آسان ہوگیا اور وہ عظیم فوج آدھے دن کے وقفے میں ہی خاک میں مل گئی۔'' بابر کے مطابق، ''ابراہیم لودھی ایک ناتجربہ کار شخص تھا جو بغیر کسی نظم و ضبط کے کوچ کرتا تھا، بغیر کسی حکمتِ عملی کے پڑاؤ ڈالتا تھا اور بغیر کسی دوراندیشی کے جنگ لڑتا تھا۔''

بابر نے اپنی اس فتح کے بعد تیزی سے پیش قدمی کی اور دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ جن خزانوں پر اس نے قبضہ کیا انھیں دل کھول کر اپنی فوجوں میں تقسیم کردیا، کچھ تو اپنی سخاوت اور کچھ اس بنا پر کہ انھیں ایک نئے ملک میں رہنے کی ترغیب مل سکے، اب بابر نے پادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

بابر نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو اس کے بیٹے ہمایوں کے عہد میں پندرہ برسوں کے وقفے کے ساتھ تقریباً تین سو برس تک قائم رہی۔ ایک طنز کے انداز میں، اس ترک کے ذریعے قائم کی گئی اس سلطنت کو ''مغل'' کہا جانے لگا۔ ایک ایسی اصطلاح جس سے بابر اور اس کے معتقدین قطعی رغبت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ ''مغل'' فارس اور وسط ایشیا کے ان جنگجو مہم جویوں کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح تھی جنھوں نے سخت جدوجہد کی تھی اور بابر

اور اس کے آباؤ اجداد کو ان کے وطن سے نکال باہر کیا تھا۔

جب بابر آگرہ میں معاملات سلجھانے میں مصروف تھا، اس کی فوجیں مشرق کی جانب افغانیوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے سنبھل کے قریب ایک افغان فوج پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دی۔ اس نے جون پور اور غازی پور پر قبضہ کر لیا۔ دہلی اور آگرہ پر بابر کا قبضہ ہونے کا مطلب تھا دہلی افغان حکومت کا خاتمہ۔ لیکن راجپوت اتحاد کی جانب سے اس کا سب سے سخت امتحان ابھی باقی تھا جنھیں ابھی تک افغانوں نے شکست نہیں دی تھی۔ میواڑ کے رانا سانگا (سنگرام سنگھ) کی سربراہی میں آمیر، گوالیر، اجمیر، چندیری، کوٹا کے رئیسوں اور کچھ دوسروں نے مل کر ایک مورچہ بنایا۔ ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی نے بھی رانا سانگا کی پناہ حاصل کر لی تھی۔ راجپوتوں اور افغانوں کی اتحادی فوجوں نے بیانہ کی طرف پیش قدمی کی۔ بابر کی فوجیں، جنھوں نے راجپوتوں کی بہادری کے بارے میں سن رکھا تھا، بے حد خوف زدہ تھیں۔ یہاں تک کہ بابر کے نجومی نے بھی اسے راجپوت فوج سے خبردار کیا تھا۔ بابر کے خیمے میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک نیا چیلنج تھا۔ لیکن وہ اس کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ نئی توپیں جمع کی گئیں۔ بابر نے اپنی بھاری توڑے دار بندوقوں کو سہارا دینے کے لیے پہیے دار تپائیاں اختراع کیں۔ اس طرح فوج میں کچھ حرکت آئی۔ اس کی پشت کانٹے دار جھاڑیوں سے محفوظ تھی اور دونوں پہلوؤں پر سوار دستے تعینات تھے۔ سامنے کی طرف چوپہیا چھکڑوں کا مورچہ تھا اور توپیں اور توڑے دار بندوقیں سبھی جگہوں پر ترتیب وار لگی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی رانا سانگا کی فوجوں نے پیش قدمی کی، بابر کی فوجوں کے دل ڈوبنے لگے۔ ان میں بدحواسی پھیل گئی اور بعض سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب بابر نے غیر اہم افغان سرداروں کے ساتھ مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور کافروں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ افغان سردار جنھوں نے رانا سانگا سے بابر کے خلاف لڑائی میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، اب پیچھے ہٹ گئے۔ رانا سانگا اور محمود لودھی کی فوجوں نے خانوا کے نزدیک جنگی منصوبہ بندی میں پچیس دن صرف کر دیے۔ اس طرح بابر کو نہایت قیمتی وقت مل گیا جس میں اس نے اپنی فوجوں کو ترتیب دیا۔ یہاں تک کہ اس نے کچھ نئی تقریریں بھی کیں جن میں بعض افغان سردار بھی شامل تھے۔

اس نازک موڑ پر وہ اپنی پوری فراست کو بروئے کار لایا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے خطاب کیا۔ ''باوقار لوگو اور سپاہیو۔ ہر وہ شخص جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ گمنامی کی زندگی سے کتنا اچھا ہے کہ ایک باوقار موت مرا جائے۔

ناموری کے ساتھ اگر میں مر بھی جاؤں تو میں اس پر قانع ہوں۔

ناموری کو میرے لیے رہنے دو، کیونکہ میرا جسم تو موت کے منہ کا نوالہ ہے

سب سے بڑا اللہ، ہمارے لیے ہمیشہ مہربان رہا ہے اور اب اس نے ہمیں ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے کہ اگر ہم لڑائی میں مارے جاتے ہیں تو ہم شہید ہوں گے اور اگر ہم زندہ رہے، تو ہم فاتح ہوں گے۔ تو آؤ ہم ایک ساتھ مل کر خدائے پاک کی قسم کھائیں کہ ہم میں سے کوئی بھی لڑائی سے منہ موڑنے کا خیال بھی نہیں کرے گا، نہ ہی کوئی جنگ اور قتل عام سے بھاگے گا یہاں تک کہ اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو جائے۔''

بابر نے اپنے آدمیوں کی موجودگی میں یہ قسم بھی کھائی کہ اگر خدا نے اسے فتح سے ہمکنار کر دیا تو وہ کبھی بھی دوبارہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور خیمے میں موجود شراب کے تمام برتنوں کو انڈیل دیا۔ سونے اور چاندی کے شراب کے پیالوں کو توڑ دیا گیا اور غریبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اچانک اس سے ذاتی وفاداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے سبھی سپاہیوں نے قسم کھائی کہ جب تک ان کے جسموں میں زندگی کی رمق باقی رہے گی وہ ایثار و قربانی سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

اب بابر نے سب سے اعلیٰ منصوبہ اختیار کیا جو پانی پت کے میدان میں کام آیا تھا۔ اس کے توپچیوں اور بندوق برداروں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کئی گھنٹوں کی سخت لڑائی کے بعد، بابر نے اپنے سوار تیراندازوں کو میدان میں اتارا، جنھوں نے راجپوت دستوں پر سامنے سے حملہ کیا۔ بابر کی توپوں نے ایک ہی وقت میں بہت سے دلیر راجپوتوں کو ہلاک کر دیا۔ جیسے ہی مخالف خیمے میں ابتری پھیلی، بابر نے اپنے بندوق برداروں کو آگے بڑھایا۔ آخر کار راجپوتوں کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ رانا سانگا خود بھی بری طرح سے زخمی ہوا تھا مگر اس کے آدمی اسے میدان جنگ سے نکال لے گئے۔ اس نے دوبارہ اپنی تیاریاں شروع کیں مگر 30 جنوری 1528 کو اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا۔

ایک مورخ کے مطابق ''خانوا کی لڑائی یقیناً ہندوستانی تاریخ کی سب سے فیصلہ کن لڑائیوں میں سے ایک ہے۔ ایک لحاظ سے اس کے نتائج دہلی کے سلطان کی شکست سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل تھے جو دراصل ایک اقتدار اعلیٰ کی حکومت کا خاتمہ تھا، جبکہ خانوا کے نتیجے میں طاقتور راجپوت اتحاد کی شکست ہوئی جس نے آئندہ کے لیے راجپوتوں کے سیاسی احیا کے مواقع کا خاتمہ کر دیا۔''

بابر نے چند برسوں تک راجپوتوں کا تعاقب کیا اور طاقتور سردار مدنی رائے کے قلعے کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کے بعد رائے سین، بھلسا اور سارنگ پور پر قبضے کی باری آئی۔ چتوڑ کا راستہ اب بالکل صاف تھا۔

اسی درمیان بہار کے افغانوں نے کچھ مخالفانہ تیور دکھائے۔ بابر نے ان کا پیچھا کیا، قنوج میں ان کو زبردست نقصان پہنچایا اور ان کے اہل خانہ اور سازوسامان پر قبضہ کرکے انھیں منتشر کردیا۔ وہ آگرہ اور دھولپور واپس لوٹا اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہوگیا۔ اس نے باغات لگوائے۔ رانا سانگا کے بیٹے کے ساتھ مصالحت کی کوشش کررہا تھا اور اپنی فوجوں کو دوبارہ ترتیب دے رہا تھا جب اسے خبر ملی کہ بہار کے افغان، جنھیں اس نے قنوج کے قریب شکست دی تھی، محمود لودھی کی سربراہی میں دوبارہ جمع ہورہے ہیں۔ بابر نے فوراً بہار کی طرف کوچ کیا اور بکسر تک ان کا تعاقب کیا۔ اس نے مشرق کی طرف مزید پیش قدمی کی اور گھاگھرا کے کناروں پر ان سے لڑائی کی اور 6 رمئی 1529 کو انھیں ایک زبردست شکست دی۔

ترک افغان سرداروں اور راجپوتوں کے عدم اتحاد کے نتیجے میں مغل سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اہم معمار، بابر نے ایک نیا سیاسی نظام پیش کیا، لودھیوں کے برعکس وہ اپنے آپ کو تمام سرداروں کے مساوی نہیں سمجھتا تھا، بلکہ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جو اپنے تمام سرداروں کو قابو میں رکھتا تھا۔

پانی پت (1526)، خانوا (1527)، اور پٹنہ (1529) کی تین جنگوں کے ساتھ ہی اس نے کابل سے گھاگھرا اور ہمالیہ سے گوالیر تک شمالی ہندوستان کا ایک بڑا حصہ فتح کرلیا۔ جو کام باقی رہ گیا تھا وہ 1530 میں اس کی موت کے بعد ہمایوں اور اکبر نے پورا کردیا۔

یہاں پر ہم شیر شاہ سوری کی مختصر حکومت کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اس کی حکومت میں جدیدیت کی تمام نشانیاں موجود تھیں، یہاں تک کہ مذہبی رواداری جس کے لیے بعد میں اکبر بہت مشہور رہوا، وہ اس عظیم افغان کی حکومت کا ایک خاصہ تھی۔

□□□

انیس کے سلام

مرتبہ: علی جواد زیدی

انیس کے سلاموں کا یہ پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ انیس کے نوحے، ایک مناجات، ایک منقبتی مخمس اور کچھ تضمینیں بھی شامل ہیں۔ سلاموں کی تعداد 102 ہے جن میں تحت اللفظ 44 اور سوز کے 58 سلام ہیں۔ انیس کے سلاموں کا یہ مجموعہ سید علی جواد زیدی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے نہ صرف اردو میں رثائی شاعری کی پوری تاریخ بیان کردی ہے بلکہ ہر دور میں اس صنف شاعری کے قابل لحاظ نمونوں کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

صفحات: 307، قیمت: -/60 روپے

انشا کا ترکی روزنامچہ

مصنف: انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں انشا اپنے زمانے کے مستند شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔
یہ روزنامچہ جو سعادت علی خاں کے دربار سے ان کی وابستگی کے دنوں کی یادگار ہے،
ترکی زبان کے اس لہجے میں لکھا گیا ہے جو "چغتائیہ" کے نام سے موسوم ہے۔
ڈاکٹر نعیم الدین نے یہ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا ہے اور مقدمے میں
اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے مندرجات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

صفحات: 68، قیمت -/4.50 روپے

اردو کی نثری داستانیں

مصنف: گیان چند جین

اردو میں جو نثری داستانیں قلمبند کی گئی ہیں، ان کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کی یہ کتاب تمام دستیاب نثری داستانوں کا تعارف بھی ہے اور ان پر تنقیدی محاکمہ بھی۔ مختلف داستانوں کے فنی مدارج اور اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 906، قیمت: -/276 روپے

اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب

مصنف: گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی اور علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ لسانیات، اسلوبیات، اساطیر، کتھا کہانی، فکشن، ادبی تھیوری، مابعد جدیدیت اور ادب شناسی میں مقامیت کے مباحث ہوں یا اردو کے پرانے اور نئے، نثر اور نظم کے نمائندہ فن کاروں کے انفرادی کارناموں کی قدر شناسی، نارنگ صاحب کے کاموں کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستانی ذہن و تہذیب کے ان سرچشموں کی نشاندہی کی ہے جن کی آبیاری سے اردو غزل سرسبز ہوئی۔

صفحات: 463، قیمت: -/250 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مخمور سعیدی

گمشدہ آدرش

(گاندھی جی کی یاد میں)

وہ سایہ

جو تپتے ہوئے راستوں پر——

سفر کرنے والوں کو تابِ سفر بخشتا تھا

جو شعلوں کو شبنم بنا دینے والی پُر افسوں نظر بخشتا تھا

وہ خوشبو

جو بنجر زمینوں کی مشکل مسافت کو آساں بنائے ہوئے تھی

جھلستی فضاؤں کو گلشن بداماں بنائے ہوئے تھی

وہ جھونکا صبا کا

جو انگلی پکڑ کر ہماری

بہاروں کے خیموں کی جانب لیے جا رہا تھا

کئی خوابِ رنگیں،

سلگتی نگاہوں کو دکھلا رہا تھا

وہ آدرش اپنا

محبت، مساوات، آزادی و امن جیسے کئی نام جس کے

سنے ہم نے شام وسحر

زندگی بخش پیغام جس کے

وہ سایہ، وہ خوشبو، وہ جھونکا صبا کا

گزرتے ہوئے وقت کے پھیلے صحرا میں——

جانے کہاں کھو گیا ہے

وہ آدرش اپنا——

ہمیں جس نے بیداریِ دل کی دولت عطا کی

ہمارے تجاہل کی بڑھتی ہوئی دھند میں منہ چھپا کر

کہیں سو گیا ہے

□□□

مشتاق صدف

ابوالکلام قاسمی سے گفتگو

سوال: آپ موجودہ تنقیدی منظرنامے سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: عصر حاضر میں جو تنقیدی رویے عام ہیں اس کے پیش نظر میں یہ سمجھتا ہوں کہ نئے نظریات کو متعارف کرانے کی روش عام ہوگئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ کسی حد تک مغربی تنقید کے رویوں سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اردو والوں کو بہت کچھ پڑھانے سکھانے کی ضرورت ہے۔ ان کو بتایا جائے کہ بین المتونیت کیا چیز ہوتی ہے اور ان کو یہ بھی بتایا جائے کہ شرحیات (علم شرح) کیا ہے۔ ان کو یہ بھی بتایا جائے کہ بین المتونیت کیا چیز ہوتی ہے۔ ان کو یہ بھی بتایا جائے اور دیکھا جائے کہ فنکار کا Reader responce (قاری اساس) یا Reader oriented theory کیا بلا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر زمانے میں وہی تنقید کارآمد رہی ہے جو قاری اور فن کار کے درمیان پل کا کام کر سکے۔ گذشتہ پینتیس چالیس سال کے دوران جدیدیت کے زیر اثر لکھی جانے والی تنقید نے ایک اہم کام یہ کیا کہ بجائے نفسیاتی، سماجی اور تاریخی پس منظر پر ساری توجہ صرف کرنے کے لوگوں کو غیر فنی حوالوں سے الگ کرنے کی کوشش کی اور یہ تصور ہیئتی تنقید کے زیر اثر آیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے کارگر تنقید وہی ہے جو تخلیق کی تفہیم اور تخلیق کار کے طریقۂ کار کی تفہیم میں زیادہ معاون ثابت ہو۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ آج کی تنقید پچاس برس پہلے کی تنقید سے بہت آگے ہے۔ آج ہم اردو تنقید کو دنیا کے تنقیدی منظرنامے کے برابر رکھ کر دونوں کا موازنہ کر سکتے ہیں اور اس کے ذریعے ادب یا ادیب کی تفہیم کا حق ادا کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

سوال: فکشن اور شاعری کی تنقید میں مختلف دشواریاں کیوں پیش آ رہی ہیں؟

جواب: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیان یا narration کی نوعیت کیا ہے اور وہ توضیح یا وضاحتوں سے کیسے مختلف ہے۔ کیسے افسانہ نگار عمل اور تعامل کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے اور افسانے میں جو بیانیہ ہے اس کا وقت کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ کیونکہ وقت ایک بڑا عامل ہے۔ کہانی میں سب سے بڑا کردار ٹائم سکونس کا ہوتا ہے اور جتنے تجربے کہانی میں کیے گئے ہیں چاہے وہ پلاٹ کی بنیاد پر ہوں یا شعور کی رو (Stream of Conciousness) کی بنیاد پر یا آزاد تلازمۂ خیال کی بنیاد پر، کردار کی نفسیات یا اس ذہن کی اسٹڈی کے تجربے کی بنیاد پر، یہ تمام تجربے وقت کے پورے ڈھانچے (Structure) کو توڑنے پر مبنی ہیں اور وقت کو توڑنے کا فلسفہ یہ ہے کہ کردار کے ظاہر اعمال یا اس کی حرکات وسکنات سے کہیں بڑی زندگی وہ ہے جو وہ اپنے ذہن میں یا اپنی نفسیات میں جینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ایک نظریہ نقاد کے ہاتھ آ گیا تو اسی نظریے کے انطباق سے وہ شاعری کو بھی پرکھ لے گا اور تنقید کو بھی، نظم اور غزل کو بھی میں سمجھتا ہوں کہ فن پارہ تنقیدی نظام تخلیق کرتا ہے۔ ہر فن پارہ ایک طرح سے تنقیدی نظام کے لیے تحریک پیدا کرتا ہے۔ کسی فن پارے کو پڑھتے وقت کبھی کبھی ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ وہ فن پارہ گہرے مطالعے کے ذریعے اپنے تمام عقدے کھولنے کے لیے تیار نہ ہو اور اس طرح آپ کا فن کار کی نفسیات اور اس کے سیاسی اور تہذیبی پس منظر

● گذشتہ دو دہائی کے دوران ادبی اور تنقیدی منظرنامے میں جن چند ناقدین نے اپنی ادبی و تنقیدی رویے اور طریقۂ کار کی بنیاد پر شناخت اور اعتبار حاصل کیا ہے ان میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے تنقیدی نظریہ سازی کے لیے مشرقی شعریات اور اصول نقد کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ان کی کتابوں میں "مشرقی شعریات اوراردو تنقید کی روایات"، "تخلیقی تجربہ"، "مشرق کی بازیافت"، "انتخاب فراق گورکھپوری"، "انتخاب انعام اللہ خاں یقین"، "ناول کا فن" (ترجمہ) "رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدروقیمت"، "اردو فکشن آزادی کے بعد" اور "شاعری کی تنقید" شامل ہیں۔ انہیں بہار اردو اکادمی، یوپی اردو اکادمی، امتیاز میر ایوارڈ، یوپی گورنر ایوارڈ اور نوائے میر ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

کی طرف جانا ناگزیر ہو جائے تو یہ نقاد کا فرض ہے کہ وہ یہ محسوس کرے کہ اس فن پارے کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کے لیے فن پارے کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ مثلاً کسی غزل کا مطالعہ آپ تین منٹ میں بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے لفظی نظام اور اس کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے کم سے کم دو گھنٹے کا مطالعہ بھی ہونا چاہیے۔ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ نظام فکشن کا ہے۔ اس لیے فکشن کے نظام کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فکشن کی نوعیت اس بات کا فیصلہ کرے کہ کس طرح کی تنقید اس پر کارگر ہو سکتی ہے اور کس طرح کی نہیں۔

سوال: ادب کی تفہیم کے لیے تنقید کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کا عمل کہاں تک مناسب ہے؟

جواب: تنقید کو کسی خاص نام سے موسوم کیا جائے یہ کوئی ضروری نہیں۔ اس کے بغیر بھی تنقیدی فریضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپ شبلی نعمانی کی تنقید، الطاف حسین حالی کی تنقید یا محمد حسن عسکری کی تنقید پر اس طرح کا کوئی لیبل آسانی کے ساتھ نہیں چپکا سکتے۔ ہر تنقید بنیادی طور پر تہذیبی اور ادبی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں سرسید تحریک چلی جس میں ادب کو زندگی کے لیے بامقصد بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ردعمل میں ادب لطیف اور رومانیت کی ایک پوری تحریک چلی جس میں یہ کہا گیا کہ ہم بہت ابلی ہوئی کھیر نہیں کھا سکتے۔ بہت دنوں تک زندگی کے لیے ادب لکھ لیا۔ ہم تو اپنے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے ادب تخلیق کرتے ہیں۔ تو اس میں رومانی تنقید یا ادب لطیف لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس میں سجاد حیدر یلدرم، میر ناصر علی، سلطان حیدر جوش، مہدی افادی اور بعد میں نیاز فتح پوری شامل ہوئے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ہم تخیل کو آزاد رکھیں گے۔ جیسے انگلینڈ میں شیلی، ولیم بلیک یا ورڈس ورتھ جیسے رومانی شعرا کے رویے تھے۔ کسی نے خواب پرستی اور عشق و عاشقی کے مسائل میں دلچسپی لینے کی کوشش کی۔ دراصل انھوں نے یہ سب حقائق سے فرار حاصل کرنے اور اپنی تسکین کے لیے کیا۔ اس کے فوراً بعد 1936 میں ترقی پسند تحریک چلی تو کہا گیا کہ سماج کو بہت زیادہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ادھر جدیدیت آئی تو کہا گیا کہ سماج پر بہت زیادہ زور دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا رجحان، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ جدید تنقید نے ایک بات بہت اچھی یہ کی کہ اس نے کلاسیکی ادب کی بازیافت کرنے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ ادب میں جب تک دبازت، تہہ داری اور عمق نہ ہو، اس کی کئی پرتیں نہ ہوں اس وقت تک وہ ادب دائمی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہو سکتا اور یہی کلاسیکیت کی بنیادی شرط ہوتی ہے۔ کلاسیکی ادب وہ ہے جو قدیم بھی ہو اور عظیم بھی اور دونوں ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں۔ یہ قدیم اس لیے ہے کہ آج تک زندہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے باوجود لوگوں نے اپنی خواہشات کا عکس اس ادب میں دیکھنے کی کوشش کی۔ عظیم اس لیے ہے کہ ہر زمانے میں وہ مفید مطلب ثابت ہو رہا ہے اور سچ بات یہ ہے کہ جدیدیوں نے اپنے لیے ایک افادیت پیدا کی۔ مابعد جدیدیت کے زیر اثر اب جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس کی معنویت یہ ہے کہ ساری دنیا میں جو ادبی نظریات سامنے آ رہے ہیں ان میں تہذیبی اور ثقافتی معاملات کو مرکز میں رکھ کر دیکھنے کی سعی کی جا رہی ہے اور اس میں نہ صرف ادب پارہ اور ادیب کا پس منظر سامنے رکھا جاتا ہے بلکہ قاری تک جب ادب پارہ پہنچتا ہے تو قاری اس پر کس طرح ردعمل ظاہر کرتا ہے اسے بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ کس عہد کا قاری ہے، اس کی تربیت کس سیاق و سباق میں ہوئی ہے، مابعد جدیدیت کے لوگ تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس عہد میں ادب پارہ لکھا گیا ہے اس عہد سے الگ ہو کر آنے والے عہد میں بھی اگر اپنی معنویت پیدا کر لیتا ہے تو وہ بڑا ادب پارہ ہے۔ مزید یہ کہ مابعد جدید ذہن کے سبب پس ماندہ طبقات، تہذیبی اور ثقافتی اکائیوں حتیٰ کہ جنسی تفریق کی بنیاد پر نظر انداز اکائیوں کو بھی اپنی شناخت کا وسیلہ ہاتھ آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری تنقید اپنی سہولت کے لیے اپنے اوپر لیبل چسپاں کرتی رہتی ہے لیکن بنیادی طور پر تنقید کسی نام سے اگر موسوم ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ دراصل وہ تنقید بڑی اور اہم ہوتی ہے جو ادب کی پرکھ بلکہ ادب کی تفہیم میں زیادہ معاون ثابت ہو۔

مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تنقید کے نئے امکانات کو برتنے میں مابعد جدید تنقید کامیاب ہوگی اور ماضی قریب کے تعصبات سے ادب اور ادب کی تفہیم کو باہر نکالنے میں مدد ملے گی۔

سوال: کیا ردعمل کے طور پر مابعد جدیدیت کے بعد بھی کوئی تحریک یا رجحان پیدا ہوگا؟

جواب: ابھی تک تو مابعد جدید تحریک یا مابعد جدیدیت کے جو رویے ہیں، انھی کے امکانات کو پورے طور پر واضح کرنے اور کھنگالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے بین المتونیت (Inter Textuality) کا مسئلہ ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بالکل نیا نقطۂ نظر ہے۔ کوئی بھی شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہوتا جو وہ نیا استعمال کرتا ہو۔ بلکہ وہ سیاق و سباق بدل کر لفظوں کو وضع کر کے نئی اضافت، نئی تراکیب اور نیا استعارہ بناتا ہے۔ غالب نے کہا ہے کہ

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو غالب نے نیا استعمال کیا ہو، سارے

الفاظ وہ ہیں جو ماقبل کے لوگ روایتی طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ ہاں غالب نے اس کا سیاق وسباق تبدیل کردیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے بین المتونیت کے ذریعے اگر ہم ادب کو سمجھتے ہیں تو ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کیا کسی ادیب نے اپنے ادبی سرمائے یا اپنے تاریخی حافظے کو نئے سیاق وسباق میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔ ابھی تو اسی کو Explore نہیں کیا گیا ہے۔ تشریحیں اور توضیحات کیسی ہونی چاہئیں ابھی تو پورے طور پر اسی کو نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قاری اساس تنقید وغیرہ کے پورے امکانات کی بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اصل میں بعض چیزوں کو خلط ملط کرنے سے گڑبڑ ہوجاتی ہے۔ ساختیات کا ایک نقطۂ نظر تھا اس نقطۂ نظر کے بعد بھی کچھ نظریے آئے لیکن تمام نظریات کے نمونوں کو مابعد جدید رویوں نے اپنالیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نام دینے پر ضد کریں تو میں کہوں گا کہ بہت دنوں تک مابعد جدید رویوں کا سلسلہ چل سکتا ہے۔

سوال: آپ نے قدیم اور عظیم ادب کا ذکر کیا تو ہم قدامت سے کیا مراد لیں۔ 1857 سے پہلے جو کچھ لکھا گیا وہی ہمارا کلاسیکی ادب ہے یا اس کے بعد جو بڑا ادب تخلیق ہوا وہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس کی حد بندی کیسے کی جائے؟

جواب: اصل میں کسی چیز کے سلسلے میں قطعی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ انگریزی میں نیوکلاسکس کے نام سے اب کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا ادب جس پر کئی زمانے گزر گئے اس کے باوجود ادب پرانا نہیں ہوا۔ ان معنوں میں کہ وہ آج بھی بامعنی معلوم ہوتا ہے اور دراصل یہی کلاسیکی ادب ہے۔ اقبال کو بھی تقریباً سو برس گزر گئے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گذشتہ سو سال میں دنیا اتنی تبدیل ہوگئی ہے جتنی پہلے چار سو سال میں تبدیل ہوئی تھی۔ اس ایک سو سال میں اتنی بڑی تبدیلیاں سامنے آئی ہیں جو صدیوں میں آیا کرتی تھیں، اتنی بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہونے کے بعد اقبال اگر زندہ ہیں تو کلاسیکی تو ہیں ہی۔ دوسری بات یہ کہ فیض کلاسیکی تو نہیں ہیں لیکن اگر فیض یا راشد، یا اختر الایمان کو نیوکلاسک کا نام دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں نئی کلاسیکی ادبیات کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے نیوکلاسزم (NEO) کا نام دیا گیا اس طرح فیض کو نوکلاسیکیت کا شاعر آپ کہہ سکتے ہیں کلاسیکی نہیں۔ لیکن اگر یہ اصطلاح آج کے کسی شاعر کے بارے میں استعمال کریں اور ہلکے پھلکے انداز میں ہی استعمال کریں اور یہ کہیں کہ فلاں شاعر ہمارے زمانے کا ہے اور اس کے اندر بعض کلاسیکی اقدار ایسی نظر آتی ہیں کہ مختلف طرح سے سوچنے والے لوگ یکساں طور پر اس سے متاثر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کلاسیکی قدر کا نام اسے دے سکتے ہیں۔

سوال: آج تخلیق کاروں کو بڑا اور چھوٹا ثابت کرنے کے لیے سوچی سمجھی حکمت عملی اختیار کی جارہی ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: ہر زمانے میں ایسا ہوا ہے۔ ہر زمانے میں کرائے کے لکھنے والے بعض لوگوں کو اونچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن وقت اتنا بڑا منصف ہے کہ دس سال میں فیصلے ہوجاتے ہیں۔ زیادہ دنوں تک انتظار کرنا نہیں پڑتا۔ کرشن موہن صاحب دہلی میں انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ ابھی پندرہ بیس سال پہلے تمام رسالوں کے نمبر ان پر نکلا کرتے تھے لیکن آج ان کا کوئی نام لینے والا نہیں ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔ اس لیے کہ وقت کی تیز رفتار موجوں نے اس تمام گردوغبار کو کنارے کرکے چھوڑ دیا۔ اس لیے اس سے غمزدہ اور پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ سیاسی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ معاشی عوامل بھی اس میں کارفرما ہوتے ہیں۔

سوال: اس عہد کے بعض نقادوں کے نام بتایئے جنھوں نے ادب میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔

جواب: میرا خیال ہے کہ ایک صف تو ہمارے بزرگ، مستند اور سربرآوردہ نقادوں کی ہے مثلاً گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی وغیرہ جن کی خدمات اور اثرات اظہر من الشمس ہیں۔ پھر ان کے کچھ کم عمر معاصرین مثلاً فضیل جعفری، شمیم حنفی، حامدی کاشمیری، وزیر آغا، مظفر علی سید، وہاب اشرفی وغیرہ۔ پھر ایک نئی کھیپ ہے جن میں سے بعض معتبر ہوچکے ہیں اور بعض اعتبار حاصل کررہے ہیں جیسے عتیق اللہ، سلیم شہزاد، خورشید احمد، قاضی افضال حسین، عقیل احمد صدیقی، شافع قدوائی، انیس اشفاق وغیرہ۔

سوال: آپ علی گڑھ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، آپ کی علمی و ادبی شخصیت کی تعمیر میں علی گڑھ کا کیا رول رہا ہے؟

جواب: اس سرزمین کا سب سے بڑا امتیاز تو یہ ہے کہ یہاں آکر اور رہ کر کچھ ہی دنوں میں آدمی اپنی افراط وتفریط سے بہ آسانی آگاہ ہوجاتا ہے اس لیے احتساب ذات کے لیے مجھے یہاں کی فضا بہت سازگار معلوم ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان اتنا برخود غلط نہ ہو کہ کبھی اپنے آپ یا اپنے رویوں پر نظر ثانی ہی نہ کرے۔ یہاں کی ادبی فضا میں یکسانیت بالکل نہیں، کچھ لوگ تحقیق میں مصروف ہیں، کچھ شاعری یا افسانے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں اور کچھ تنقید اور تعین قدر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ کوئی گروہ دوسرے کو جاہل یا غیر علمی اور غیر ادبی قرار دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہاں نئے سے نئے نظریات اور تنقیدی تصورات کی گونج ضرور سنائی دیتی ہے مگر ان تصورات سے حد سے بڑھی ہوئی وابستگی کبھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی اس لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کسی بھی ادبی رویے کو حشو وزوائد کی تخفیف کے بغیر قبول کرنے کے لیے کبھی

آمادہ نہیں ہوتا۔ میں علمی اور ادبی طور پر جو کچھ بھی ہوں، اگر کہیں اور ہوتا تو وہ بھی نہیں بن پاتا۔

سوال: اپنے زمانے کی شعری سرگرمیوں کے بارے میں آپ کا عام تاثر کیا ہے؟

جواب: اپنے زمانے کی شعری سرگرمیوں کے بارے میں رائے دینا کسی شدید ردعمل کو دعوت دینے سے عبارت ہے۔ دراصل تخلیق کاروں کی اکثریت ایسی ہے جن کو معروضی رائے سننا گوارا نہیں۔ نئی نسل کے لوگوں میں ہندوستان میں مجھے سب سے زیادہ توانا آواز فرحت احساس کی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں فکری بلوغت کے ساتھ جو سلیقۂ اظہار ملتا ہے وہ بے مثال ہے۔ ان کے علاوہ عالم خورشید غزل کے بہت محتاط اور سلیقہ مند شاعر ہیں۔ خورشید اکبر کی آواز خاصی توانا ہے۔ خالد عبادی میں خداداد صلاحیت ہے۔ شکیل اعظمی، مشتاق صدف، احمد محفوظ، سراج اجملی، ارشد عبدالحمید اور عبدالحمید کی غزلیں بھی اپیل کرتی ہیں اور اپنی اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ کشمیر کے نذیر آزاد اور شفق سوپوری کے یہاں بڑے امکانات موجود ہیں اور ان شعرا نے اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ معراج رعنا عبدالاحد ساز اور شہپر رسول نسبتاً سینئر نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو داں طبقے کو تکنیکی تعلیم فراہم کرانے کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کی افادیت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: کونسل کی فعالیت قابل تعریف ہے۔ کونسل نے ادھر چار پانچ برسوں میں کمپیوٹر کی تعلیم سے ایک نسل کی آبیاری کی ہے۔ مختلف مقامات پر کونسل کی جانب سے قائم کیے گئے مراکز سے اردو داں طبقے کو بہت فائدہ ہورہا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ ان سرگرمیوں میں مزید تیزی آئے گی۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل نے جو کام کیے ہیں ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

جواب: قومی سطح پر دیکھا جائے تو قومی اردو کونسل ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس کی کارکردگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ زبان و ادب کی کتابوں کی اشاعت ہو یا مختلف اداروں کو مالی تعاون یا پھر دیگر سہولیات، کونسل نے ہر شعبے میں نمایاں کام کیا ہے۔ ادھر اچھی اچھی کتابوں کے ترجمے بھی سامنے آئے ہیں۔ مختلف سیمیناروں، ورک شاپ، کتاب میلوں اور کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعے کونسل نے اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مخطوطوں کی بازیافت بھی کی ہے۔ اس کے لیے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام کوئی پیغام؟

جواب: اردو اخبارات، رسائل و جرائد خرید کر پڑھنا آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اردو کے فروغ کے کاموں میں گروہ بندی سب سے زیادہ نقصان دہ ہے، اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

381/22 E, Zakir Nagar, Okhla,
New Delhi-110025

□□□

مرزا محمد رفیع سودا

مصنف: خلیق انجم

سودا کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو اختلاف نہیں۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی انھوں نے جو طبع آزمائی کی ہے وہ ان کی قادر الکلامی اور ہمہ گیری کا بین ثبوت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر خلیق انجم نے سودا کے سوانحی حالات، ان کے عہد کے سماجی کوائف اور ان کوائف سے ان کے دل و دماغ پر مرتب ہونے والے اثرات کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور ان کے شاعرانہ کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب سودا ہی کو نہیں، ان کے عہد کو سمجھنے میں بھی مدد کرتی ہے۔

صفحات: 673، قیمت: -/173 روپے

کلیاتِ ذوق (اردو)

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

شیخ محمد ابراہیم ذوق کا تمام و کمال اردو کلام اس کلیات میں شامل ہے۔ ذوق کا دیوان اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بعض شاگردوں نے جن میں ظہیر دہلوی، حافظ ویران اور مولانا محمد حسین آزاد شامل ہیں، ان کا منتشر کلام یکجا کرکے اپنے اپنے طور پر شائع کیا۔ یہ کلیات تنویر احمد علوی نے ان تمام نسخوں کو، جواب تک شائع ہوئے ہیں، سامنے رکھ کر تحقیقی نہج پر مرتب کیا ہے۔

صفحات: 496، قیمت: -/93 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ساجدہ زیدی ہماری مطبوعات ''انسانی شخصیت کے اسرار ورموز'' سے اقتباس

شخصیت۔ کردار۔ اور مزاج

تقریباً انیسویں صدی کے اواخر تک کردار اور شخصیت دونوں الفاظ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اور جہاں تک ہمیں علم ہے دوسری زبانوں میں بھی کم وبیش ایک ہی معنی میں رائج تھے بلکہ کردار سے الگ شخصیت کا کوئی خاص تصور ہی نہ تھا (علاوہ بعض فلسفیانہ تصورات کے، لیکن فلسفے کے بھی اکثر تصورات شخصیت کا اخلاقیاتی مفہوم اور اخلاقی تاویل پیش کرتے تھے) درآں حالیکہ کردار ایک اخلاقی تصور ہے اس کا تعلق عمل کے اس دائرے سے ہے جو خیر وشر، سچ، جھوٹ اور اچھے اور بُرے کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی تعبیر اخلاقیات اور اقدار کے نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ جو شخص اخلاقی اعتبار سے قابل اعتراض ہوتا ہے جس کا عمل مروجہ یا دائمی اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے اور جس کو سماج اس کے عمل کے اخلاقی پہلو کی وجہ سے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے اس کا کیریکٹر یا کردار ''خراب'' ہے یعنی کردار کی کسوٹی اخلاقیات اور خیر وشر کے پیمانے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خود سماجی اقدار بھی زماں ومکاں، مذہب وملت، سماج اور گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اور بدلتی بھی رہتی ہیں لیکن کسی مخصوص دور کے مخصوص سماج میں جس عمل کو بھی شر، برائی یا گناہ سے تعبیر کیا جائے گا اس کے حامل شخص کا کردار خراب کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر مشرق کے زیادہ تر ملکوں میں جنسی آزادی یا آزادفشی کو بے راہ روی سمجھا جاتا ہے اور مذہب کی رو سے بہت معیوب فعل گردانہ جاتا ہے۔ شادی سے پہلے جنسی تعلقات خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں سماج کے بعض فرقوں میں ناقابل معافی جرم سمجھے جاتے ہیں اور عموماً ایسی عورتوں کے لیے یہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ اس کا کیریکٹر خراب ہے۔ برخلاف اس کے مغرب کے بیشتر ممالک میں آج کے دور میں جنسی تجربہ ایک بہت مستند اور جانا بوجھا فعل ہے۔ جس کو سند قبولیت حاصل ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو ایسی لڑکیوں میں کوئی بنیادی نفسیاتی خامی یا کمزوری سمجھی جاتی ہے جن کے شادی سے پہلے ایک سے زائد اشخاص سے جنسی تعلقات نہ رہے ہوں اور مردوں کے سلسلے میں بھی یہی رویہ عام ہے ان سماجوں میں نہ یہ عمل گناہ ہے اور نہ ہی کردار کی خرابی کی نشانی ہے۔

اسی طرح دنیا بھر کے زیادہ تر سماجوں خصوصاً ان صنعتی اور نیم صنعتی سماجوں میں جنھیں ہم تہذیب یافتہ کہتے ہیں ایک سے زائد شادی (اسلامی ممالک کو چھوڑ کر) نہ تو قانونی طور پر جائز ہے اور نہ سماجی طور پر قابل قبول ہے۔ یہ پابندی بھی عورت کے لیے زیادہ کڑی ہے اور اگر یہ دریافت ہو جائے کہ کوئی عورت پوشیدہ طور پر بیک وقت کئی یا دو شوہروں کی بیوی ہے تو یقیناً اسے اخلاقی طور پر مذموم اور اس کے کیریکٹر کو خراب اور قابل گرفت سمجھا جائے گا جبکہ آج بھی بعض گوشوں اور خود ہندوستان میں بعض ایسے قبائل موجود ہیں جن میں عورتوں میں کثیرالازدواجی کا رواج ہے بلکہ رسم ہے اور ان کے یہاں یہ فعل قطعاً مذموم نہیں۔ نہ ہی خراب کردار کی علامت ہے۔ یہ صرف ایک سماجی طرز حیات ہے جو سماج میں مروجہ اقدار کی رو سے جائز ہے لہٰذا خراب کیریکٹر کے ضمن میں نہیں آسکتا۔

ان نسبتاً طویل مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ کردار ایک اخلاقی تصور ہے اور اس کا تعلق ایک طرف تو مروجہ اخلاقی اقدار سے ہے اور دوسری طرف خیر وشر کے کم وبیش مطلق عالمگیر اور وسیع تر تصورات سے ہے۔ مطلق، منظم اور عالمگیر اخلاقی تصورات کا پیمانہ مذہب بھی ہوسکتا ہے اور فلسفۂ اخلاقیات بھی، صوفیانہ تصورات بھی اور روحانی مسلکات بھی عموماً وہ ہر نقطۂ نظر سے خیر یا شر ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل ہر زمانے اور کم وبیش ہر سماج میں مذموم عمل اور قاتل کا کردار قابل اعتراض کردار تصور کیا جائے گا۔ اسی طرح زنا بالجبر، غارتگری، نسل کشی، ظلم، بے انصافی، بربریت، بے ایمانی اور کمزور کا استحصال ایسے اعمال ہیں جو کم وبیش ہر سوسائٹی اور ہر زمانے میں مذموم یا گناہ وجرم قرار دیے جاتے ہیں۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ فی زمانہ، اثر رسوخ، دولت واقتدار کے ذریعے ہر جرم کا ارتکاب چھپایا جاسکتا ہے بلکہ اسے قبولِ عام کی سند مل جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کردار کا حوالہ کم وبیش ہمیشہ اچھے بُرے قابل اعتراض اور قابل ستائش قابل نفرت اور قابل عزت مذموم اور مستحسن کی صفات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں کہ طاقت بحیثیت خود ایک قدر مستحکم سمجھی جاتی ہے۔ کردار کا حوالہ مضبوط اور کمزور کی صفات سے بھی دیا

● علم نفسیات کا سب سے اہم پہلو شخصیت کی نفسیات ہے۔ اس کتاب میں انسانی شخصیت کی کرداری، تحرکی، جبلی، فعلی اور امکانی عناصر اور ان کی نمو پذیر شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔456 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 123 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جانے لگا ہے۔ یعنی مضبوط کردار کے آدمی کو بہ نگاہ تحسین دیکھا جاتا ہے۔ کردار کی پختگی فی نفسہٖ ایک قدر سمجھی جاتی ہے اس کے برخلاف کمزور کردار کمزوری اور کم مائیگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ انگریزی زبان میں کمزور کردار والے کے لیے بد کردار (Character less) کی ترکیب رائج ہے۔ یعنی کمزوری سے خود کردار کی ہی نفی ہوئی ہے۔ کردار کی یہ درجہ بندی بھی مروجہ اقدار سے کردار کی وابستگی کی ہی غماز ہے۔

کردار شخصیت کا وہ پہلو ہے جس کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اقدار کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے، خیر وشر کے مطلق تصورات کے تحت اس کی تعبیر کی جاتی ہے یا اسے پسندیدہ و مذموم کے زمانی اور مکانی تصورات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہم بعض معروضی خصوصیات کے ساتھ لفظِ کردار وابستہ نہیں کرسکتے۔ مثلاً جذباتی رجحان۔ عقلی رجحان تخلیقی رجحان وغیرہ کردار کی خصوصیات نہیں سمجھی جاتیں۔ ہم کسی کے کردار کو جذباتی کردار یا تخلیقی کردار وغیرہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان رجحانات کا مفہوم بڑی حد تک معروضی ہے اور اخلاقی اقدار سے بیگانہ ہے۔ مثال کے طور پر نہ جذباتی ہونا کوئی اخلاقی عیب ہے اور نہ ہی عقلیت پسند ہونا بحیثیت خود کوئی خوبی یا برائی ہے یہ شخصیت کے بعض نمایاں رجحانات ہیں اور بس۔ لہٰذا گو کہ خیر وشر کے تصور سے ماورا ہیں لیکن نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

کردار کے برخلاف شخصیت ایک ایسا وقوعہ ہے جو بڑی حد تک اخلاقی اعتبار سے معروضی حیثیت رکھتا ہے۔ شخصیت اچھی یا بُری، کم یا زیادہ، مذموم یا پسندیدہ، نہیں ہوتی شخصیت دلچسپ، گہری، سطحی، اکہری، پیچ در پیچ، پرلطف، بیزار کن، صحت مند اور مریض تو ہوسکتی ہے لیکن کسی بھی نوع کی شخصیت کم یا زیادہ کے یا اچھے یا بُرے کے ضمن میں نہیں آتی۔ ممکن ہے عام آدمی کے لیے ان مختلف شخصیتوں میں خوبی اور برائی کے پہلو موجود ہوں لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے اور نفسیات کے طالب علم کے لیے ہر شخصیت بلحاظ وقوعہ یکساں ہوتی ہے یعنی اس کی یکساں اہمیت ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ماہرین نفسیات کے لیے مجرموں، منحرفوں، ذہنی مریضوں ابنارمل لوگوں، منتشر ومضطرب ہستیوں کی شخصیت عام نارمل آدمی کی شخصیت سے کہیں زیادہ اہم، دلچسپ اور قابلِ غور وفکر ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا کام شخصیت کی پیچیدگی کو سمجھنا اس کے لاشعوری عوامل تک رسائی حاصل کرنا اور اس کے انحراف و اضطراب کا ادراک حاصل کرنا ہے کہ اس میں جاری و ساری فکری اور جذباتی دھاروں سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔ ان کے لیے ہر عجیب شخصیت ایک لمحۂ فکر یہ ہوتی ہے، اور بسا اوقات ایک مجرم یا قاتل کی شخصیت بھی عام مطابقت پذیر آدمی کی شخصیت سے کہیں زیادہ نفسیاتی معنویت کی حامل ہوتی ہے اور اس کا مطالعہ عام شخصیت سے زیادہ دلچسپ اور فکر انگیز ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے مطالعے سے انسانی شخصیت کی پیچیدگی اور کج روی کے بنیادی محرکات تک رسائی ہوسکتی ہے اور بعض دوررس نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ کوئی کلیہ بھی نہیں ہے لیکن اس میں بہت بڑی نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے۔ اسی طرح تخلیقی فنکاروں، آرٹسٹوں، سائنس دانوں، شاعروں اور فلسفیوں وغیرہ کی شخصیات بھی ماہرین نفسیات کے لیے بہت معنی خیز ہوتی ہیں۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ آرٹ، ادب، شعر، علم اور تہذیب کے خزانوں میں اضافہ کرنے والے اشخاص ہوتے ہیں۔ لہٰذا سماج اور افراد کی توجہ کا مرکز ہونے کے زیادہ مستحق ہیں بلکہ اکثر اوقات اس لیے بھی کہ عموماً ان کی شخصیتوں میں بظاہر جو بے راہ روی، افراط و تفریط کجروی انحراف ژولیدگی، انتشار، اضطراب، بے خودی، شدت اور بیضابطگی پائی جاتی ہے وہ بحیثیت خود نفسیاتی دروں بینی میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور نفسیات انسانی کے اعتبار سے ایک ایسی معروضی حقیقت ہے جس پر اچھے، برے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا بلکہ جسے سمجھا جاتا ہے اور جس کے مبہم ترین گوشوں تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے عام گفتگو کے یہ جملے کہ فلاں آدمی کی ''پرسنلٹی اچھی ہے'' یا ''اس میں بالکل پرسنیلٹی نہیں ہے۔'' نفسیاتی نقطۂ نظر سے تقریباً بے معنی ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق زیادہ سے زیادہ شخصیت کے صوری اور جسمانی پہلو سے ہوتا ہے دوسرا جملہ اس لحاظ سے بھی بے معنی ہی رہتا ہے کہ وہ غلط بینی کی علامت ہے۔

اس بحث سے کم و بیش یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ شخصیت جیسی نفسیاتی معروضی حقیقت کو کردار جیسی تقدیری (اقدار سے وابستہ) حقیقت سے خلط ملط کرنا صحیح نہیں ہے۔ ایک ماہر نفسیات کا یہ فرض ہے کہ وہ کردار اور شخصیت کے فرق کو واضح کرے اور شخصیت کی تعبیر و تجزیے میں اس فرق کو ملحوظ رکھے اور ہر دو تصورات کی الگ الگ تعبیر پیش کرے۔

ایک اور تصور جسے عموماً اور بالخصوص عام بول چال میں شخصیت سے خلط ملط کیا جاتا ہے ''مزاج'' ہے۔ مزاج وہ تصور ہے جسے پچھلی صدی کے ماہرین نفسیات بھی شخصیت کی ہم معنی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ شخصیت اور مزاج میں کیا فرق ہے اور مزاج کسے کہتے ہیں۔ مزاج درحقیقت قدیم ترین علم الحکمت (طب) اور اس سے متعلق علم النفسیات سے ماخوذ اصطلاح ہے۔ یہ وہ تصور ہے جس کا تاریخی تسلسل قدیم ترین علم منظم سے لے کر آج تک برقرار ہے اور ہم علم طب اور نفسیات کی کتابوں میں آج بھی اس کا تذکرہ اور حوالہ دیے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ مزاج کے اعتبار سے شخصیت کی تقسیم ایک طرح سے (Typology) یا ''تقسیم بلحاظ ٹائپ'' کی ابتدائی اور مستند ترین تقسیم ہے جس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی۔

یونانی حکمت کی رو سے انسانی مزاج اخلاط کی کیفیت کا عکس ہوتا ہے۔ یعنی انسان کے جسم میں جو چار اخلاط......خون، بلغم، صفرا اور سودا ہوتے ہیں وہ اس کے جسمانی مادی وجود میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور متعلقہ مزاجی، کیفیات (یا کردار اور شخصیت) کے ذریعے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس ثلاثی تقسیم کا منبع درحقیقت یہ خیال ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک کائنات اصغر ہے لہٰذا جن عناصر سے مل کر یہ کائنات بنی ہے ان کی موجودگی انسان کی جسمانی طبعی ساخت میں بھی ضروری ہے اور ان ہی عناصر کا اظہار اس کی نفسیاتی خصوصیات میں بھی ہوتا ہے یعنی ربط کا یہ سلسلہ یوں چلتا ہے کہ کائنات میں شامل عناصر (ان کی خصوصیات) ان ہی خصوصیات کے حامل انسان کی ذات میں شامل عناصر اربعہ) یا اخلاط اربعہ) ان سے متعلقہ خصوصیات کی حامل، مزاجی کیفیات ہیں جو شخصیت کے تعین کا طبعی، نفس منبع ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ چار عناصر جو کائنات میں موجود ہیں، یعنی جو کائنات میں عناصر ہیں۔ ہوا، مٹی، آگ، اور پانی وہی انسانی ذات میں بھی ہیں، انسانی ذات کائنات اصغر ہے اور اخلاط اربعہ (چار بنیادی اخلاط) انسانی ذات میں خون، سودا، صفرا و بلغم ہیں اور وہی انسانی شخصیت میں چار بنیادی کیفیتیں ہیں جن کو چار مزاجی کیفیتیں کہا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشے سے یہ تعلق واضح ہوجائے گا۔

عناصر کائنات	ان کی خصوصیات	ان سے متعلقہ اخلاط	چار اخلاط سے متعلقہ مزاج یا مزاجی کیفیات
ہوا	گرم اور مرطوب	خون	دموی مزاج
مٹی	سودا اور خشک	سودا	سوداوی مزاج
آگ	گرم اور خشک	صفرا	صفراوی مزاج
پانی	سرد اور مرطوب	بلغم	بلغمی مزاج

ٹائٹ نفسیات کے لحاظ سے یہ چار بنیادی مزاجی کیفیات، ایک طرف تو انسان کی جسمانی ساخت، خدوخال، چہرے کے تاثرات وغیرہ کے مطابق اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتی ہیں۔ دوسری طرف اپنی مزاجی کیفیات یعنی ''نمایاں میلانات'' اور ''جذباتی ساخت'' کی بنا پر پہچانی جاسکتی ہیں۔ مزاجی نفسیات میں جسمانی اور مزاجی ساخت دونوں کی بڑی اہمیت ہے جیسا کہ پچھلے بیان میں دونوں کے نامیاتی تعلق سے ظاہر ہوتا ہے لیکن شخصیت کی نفسیات میں مزاجی کیفیت کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کہ مزاج کا تعلق جسمانی ساخت اور نفسیاتی کیفیات دونوں سے گہرا اور مستقل سمجھا جاتا ہے۔

عموماً شخصیت کو ہم بعض وسیع تر تصورات سے بھی پہچانتے ہیں مثلاً یہ کہ کسی کی شخصیت میں کتنی گہرائی یا وسعت، تنگی یا سطحیت ہے کتنا جوشیلا پن ہے یا سکون ہے۔ آیا وہ مزاجاً خوش طبع ہے یا چڑچڑا ہے یا زودرنج ہے وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے تصورات کو بھی ان ہی مزاجی کیفیات سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اور مختلف مزاجوں میں ان کا مختلف انداز سے اشتراک ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشوں سے یہ واضح ہوجائے گا کہ عموماً کن مندرجہ بالا شخصیاتی تصورات کو کن مزاجوں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

نقشہ نمبر 2

	گہری (عمیق)	اُتھلی (سطحی)
وسیع	صفراوی (Choleric)	دموی (Sanguine)
تنگ	سوداوی (Melancholic)	بلغمی (Phlegmatic)

نقشہ نمبر 3

	ہنس مکھ یا خوش طبع	چڑچڑی یا بدمزاج
جوشیلا	دموی	صفراوی
پرسکون	بلغمی	سوداوی

اوپر کے نقشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان چار مزاجوں میں سے ایک کو لیا جائے تو اس کی مختلف نمایاں خصوصیات ہوں گی۔ مثلاً دموی مزاج کو لیجیے۔ ایک طرف اس قسم کی شخصیت تنگ اور گہری ہوگی تو دوسری طرف جوشیلی اور ہنس مکھ ہوگی پھرتیلی اور کمزور نہ ہوگی۔ اگر ان خصوصیات کی زیادہ تفصیل میں جائیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ مختلف مزاجوں سے کن کن شخصی خصوصیات کی آمیزش سے متعلق بھی جاتی ہے۔

دموی یا (Sanguine) مزاج کا تعلق خون سے ہے یعنی اس مزاج کے آدمی کی جسمانی عناصر ترکیبی میں خون کی زیادتی ہوگی اور اس کے مقابلے میں دوسرے عناصر کی کمی اس قسم کے فرد کی نفسیاتی خصوصیات میں عموماً جوشیلا پن سرگرمی، زندہ دلی رجائیت، وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عملی لحاظ سے زیادہ واثق اور پختہ ہوتا ہے اپنے ارادے کا پکا اور خود اعتماد ہوتا ہے اس کی مخصوص جسمانی اور مزاجی ساخت کی آمیزش سے اس میں تناسب و توازن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اور عموماً وہ ایک امید پرست قسم کا انسان سمجھا جاتا ہے جس کی فطرت کو اداسی غمگینی اور بدمزاجی وغیرہ سے بہت دور سمجھا جاتا ہے ایسے لوگ عموماً سماجی کارکن اور پیشے کے اعتبار سے کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے برخلاف سوداوی (Melancholic) مزاج کا تعلق سودا سے ہے اس کی جسمانی ساخت کے عناصر میں کالے پت یا Black Bile کا عنصر دوسرے جملہ عناصر پر غالب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے مزاج میں وحشت، سودا اور خفقان کا مادہ ہوتا ہے۔ ایسے مزاج کو مالیخولیائی مزاج بھی کہتے ہیں وہ اکثر اداس ملول اور دل گیر رہتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک قسم کی غمناکی مایوسی

اور اکثر اوقات قنوطیت کے رجحانات نمایاں ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ دموی مزاج کے آدمی کی طرح رجائی پرعزم اور جوشیلا ہوتا ہے اور نہ ہی بلغمی مزاج کے آدمی کی طرح ٹھس اور کاہل بلکہ اس میں زود حسی اور تنک مزاجی کی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں وہ جلد غمگین ہوتا ہے اور طبیعت میں گہرائی ہونے کی وجہ سے دل میں بات رکھتا ہے۔ آسانی سے بھولتا نہیں۔ اس میں دموی مزاج کی ارادے کی پختگی اور عمل کی سرگرمی نہیں ہوتی بلکہ گہری۔ اداسی اور زود رنج قسم کی حساسیت ہوتی ہے۔ شاعروں، فلسفیوں اور فنکاروں میں اکثر یہ مزاج نمایاں ہوتا ہے۔ ایسے لوگ عموماً عملی لحاظ سے کامیاب اور پختہ کار نہیں ہوتے نہ ہی ان میں لیڈر شپ کا مادہ اور سماجی ہر دلعزیزی کی کئی خاص خصوصیات ہوتی ہیں۔ زندگی سے ان کا تعلق احساس کی گہرائی کی بنا پر زیادہ اور عمل و ارادے کی پختگی کی بنا پر کم ہوتا ہے۔

اسی طرح کے تجزیے کی رو سے صفراوی (یا Choleric) مزاج کی تعبیر کریں۔ تو اس میں کیوں کہ جسمانی لحاظ سے صفرا یا پت یا زود آب کی زیادتی ہوتی ہے اس لیے اس کی طبیعت میں تندمزاجی کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کی نفسیاتی خصوصیات میں ایک طرف تو چڑچڑاپن، غصہ، خفگی، تنک مزاجی اور تند و تیز مزاجی شامل ہوں گی دوسری طرف وہ ارادہ اور عمل کی مضبوطی۔ تیز اور پھرتیلا پن، وسعت اور گہرائی جیسی خصوصیات کا حامل ہوگا۔ اس طرح کے اشخاص عموماً لیڈر یا کھلاڑی ہوتے ہیں اور عملی زندگی میں کامیاب اور پختہ کردار کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔

چوتھی اور آخری مزاجی قسم بلغمی (Phlegmatic) ہے۔ یہ وہ اشخاص ہوتے ہیں جن کے جسمانی عناصر میں بلغم کا جز زیادہ اور خون و صفرا وغیرہ کا کم ہوتا ہے۔ ان اشخاص کے مزاج میں نہ تو دموی کا سا جوشیلا پن ہوتا ہے نہ سوداوی کی سی وحشت اور اداسی اور نہ ہی صفراوی کی سی تندی اور تیزی بلکہ بلغمی مزاج کا آدمی عموماً کاہل اور ٹھس قسم کا ہوتا ہے۔ کردار کے اعتبار سے وہ دموی کی طرح مضبوط نہیں بلکہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں سوداوی کی طرح کی گہرائی بھی نہیں ہوتی بلکہ ایک قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ کردار کی کمزوری اور طبیعت سطحیت مل کر عموماً ایک خوش مزاج اور ٹھس شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ اس میں جوش کی جگہ سکون اور غصہ و خفگی اداسی اور غمگینی کی جگہ خوش طبعی اور دوست گری ہوتی ہے۔ ایسا آدمی عموماً سب کا دوست ہوتا ہے اور کسی کے ساتھ لڑائی باندھنے پر مائل نہیں ہوتا۔ سماجی اعتبار سے بلغمی مزاج کا آدمی کافی پسندیدہ اور ہردلعزیز ہوتا ہے کیوں کہ نہ تو وہ غصے کی زیادتی اور مزاج کی تیزی کی وجہ سے کسی کو دکھ پہنچاتا ہے اور نہ ہی اپنی رائے اور ارادے کی پختگی کی بنا پر ایک زبردست آدمی کا رول ادا کرتا ہے۔

ان چار قسم کے مزاجوں کی قدرے تفصیلی بحث سے ان کی متعلقہ نفسیاتی خصوصیات کا اندازہ تو ہوتا ہے لیکن ان کی جسمانی ساخت کا نہیں۔

دموی مزاج کا آدمی دیکھنے میں عموماً جاذب نظر اور متناسب الاعضا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے خوش مزاجی اور خوش دلی کا اندازہ ہوتا ہے اس کی جسمانی صحت اچھی اور جسمانی ساخت اکثر دلفریب ہوتی ہے۔ اس میں ایک بچے کی سی رجائیت ہوتی ہے لہٰذا اس کے چہرے پر بھی کسی حد تک معصومیت اور دل پذیری ہوتی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے متناسب اور نفسیاتی اعتبار سے کسی حد تک متوازن ہوتا ہے۔

سوداوی یا مالیخولیائی مزاج کے لوگوں کی جسمانی ساخت دموی مزاج کے اشخاص سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ عموماً دبلے پتلے نحیف و نزار جسم کے ہوتے ہیں۔ تنک مزاجی، دلگیری اور زود حسی کی وجہ سے ان کے چہرے مہرے پر بھی ایک اداس اور حساس کیفیت طاری رہتی ہے۔ ان کے اعضا عموماً متناسب نہیں ہوتے بلکہ سر ذرا بڑا، جسم دبلا اور قد لمبا چال ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے۔ اکثر دلگیری کی وجہ سے ان کی تیوری پر بل پڑے رہتے ہیں یا گہری سوچ کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ مزاج میں عمق ہوتا ہے مگر سستی کی وجہ سے نہ تو ان کی چال ڈھال میں تیزی ہوتی ہے نہ چہرے پر بشاشت کے آثار اور نہ ہی جسم میں چاق و چوبند انداز۔ یہ لوگ فطرتاً گہرے اور حساس ہونے کی وجہ سے چہرے سے بھی دلگیر اور اداس نظر آتے ہیں۔

صفراوی (Choleric) مزاج کے لوگ دیکھنے میں سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کے اعضا میں چستی اور پھرتیلا پن ہوتا ہے۔ متناسب مضبوط اور قوی ہوتے ہیں۔ اور قوت اور صحت کا تاثر چھوڑتے ہیں۔ دموی مزاج کا شخص بھی صحت مند معلوم ہوتا ہے لیکن صفراوی صحت مندی قوت اور عزم کا مرکب ہوتا ہے۔ اس کے چہرے میں چوڑے جبڑے ارادے کی پختگی، اور بھنچے ہوئے ہونٹ تندمزاجی کی غمازی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے لوگ عملی لحاظ سے پختہ اور واثق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی چال ڈھال میں بھی سختی، رعونت اور خود اعتمادی کا انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں دموی کا سا رچاؤ اور معصومانہ ایکسپریشن نہیں ہوتا بلکہ اس کی جگہ تند و تیز گہری اور غصیلی کاٹ سی ہوتی ہے۔ جو ان کی مخصوص مزاجی کیفیات سے متعلق بھی ہوتی ہے اور ان کا آئینہ بھی۔

بلغمی (Phlegmatic) آدمی اپنی جسمانی ساخت کی بنا پر الگ ہی پہچانا جاتا ہے اس کا بدن کسرتی نہیں بلکہ موٹا ڈھیلا ڈھالا اور کاہل ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ گول مٹول آنکھیں موٹاپے میں دھنسی ہوئی گردن موٹی توند آگے کو نکلی ہوئی اور کولھے کسی قدر پتلے ہوتے ہیں۔ صفراوی کے برعکس جس کا بدن

کسرتی اور مضبوط ہوتا ہے۔ بلغمی کا بدن موٹا اور تھل تھلا ہوتا ہے اس کی آنکھوں میں بھی صفراوی کی آنکھوں کی کاٹ اور تیزی کے بجائے ایک قسم کا سویا سویا پن اور بجھا بجھا انداز ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت کی کاہلی اور سستی اور اس کے چال ڈھال کے ڈھیلے پن میں ایک مناسبت ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ ہر قسم کی کدورت، بغض کینہ اور تند مزاجی کے تاثرات سے خالی ہوتا ہے۔ یہ ایک کسی قدر ہنس مکھ، دوستانہ او رمہربان چہرہ ہوتا ہے اور یہی خصوصیات اس کے مزاج کو بھی دوسرے مزاجوں سے ممیّز کرتی ہیں۔

ہم عموماً سب موٹے اور کاہل قسم کے لوگوں کو خوش مزاج اور پرسکون مہربان اور دوست دار سمجھتے ہیں اسی طرح دبلے پتلے اداس اور مغموم اشخاص کو زود رنج، گوشہ نشیں، آدم بیزار اور حساس سمجھتے ہیں۔ اس طرح چوڑے جبڑے، اچھی کاٹھی مضبوط پٹھوں اور بھینچے ہوئے لبوں والے کو عموماً سخت گیر، ارادے کا پکا خود اعتماد اور باعمل آدمی تصور کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام بول چال اور زندگی کے روزمرہ شعور میں بھی یہ بات رچ بس گئی ہے کہ جسمانی ساخت اور خدوخال کا تعلق شخصی خصوصیات اور مزاج سے ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مناسبت کا ادراک مزاجی ٹائپ نفسیات ہی کی دین ہے۔

ان چار ٹائپوں میں یہ خصوصیت ہے کہ اول تو کم و بیش ان کو سب ہی ماہرین نفسیات نے کسی نہ کسی حد تک مانا ہے دوسرے ان کو بعد کے بعض ماہرین نفسیات نے سائنسی طریقے سے پرکھ کر ان کی خصوصیات کو جدید معروضی نقطۂ نظر سے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان پر تجربے کر کے ان کے اعتبار کو مزید قائم کرنے کا کام کیا ہے۔ ان میں سے ''شیلڈن'' کا کام اہم ہے۔ جس نے سائنسی طریقے سے ان چار مزاجی ٹائپوں میں پوشیدہ بنیادی صداقت کی ازسرِنو دریافت کی ہے۔ اس صداقت کا خاص پہلو جسم کی ساخت اور مزاج کی کیفیت کا جسمانی کیمیا سے تعلق ہے۔

دورِ جدید کی نفسیات میں بھی ہم بعض غدود اور ان کے فعل کو جذبوں سے وابستہ مانتے اور مزاجوں سے منسلک سمجھتے ہیں۔ غدود کا عمل بھی جسم کا کیمیائی عمل ہے اور بعض غدود کے فعل کی اگر شدید زیادتی یا بے حد کمی ہوجائے تو اس سے تمام جذباتی عمل متاثر ہوتے ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو تمام تر جذباتی زندگی شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال تھائی رائڈ غدود کے فعل کی کمی یا بیشی ہے۔ جس سے جذبات و کیفیات پر شدید اثرات پڑتے ہیں یعنی جذباتی عمل میں شدت یا بے حسی پیدا ہوجاتی ہے۔ لہٰذا آج بھی شخصیت کی نفسیات میں ہم جسم کی کیمیا اور اس کے مزاجی مترادفات سے کافی کام لے سکتے ہیں اور شخصیت کی تشکیل میں ان کی اہمیت کو نظرانداز نہیں سکتے۔

اس کی ایک مثال ہماری بول چال کے محاوروں اور ترکیبوں سے بھی دی جاسکتی ہے جن میں جسم کی کیمیا اور عناصرِ ترکیبی کا حوالہ پنہاں ہوتا ہے مثلاً آگ کا بنا ہوا مزاج ''مٹی مزاج''، ''ہوائی باتیں''، ''رقیق القلبی''، ''خشک مزاجی''، ''سردمہری''، ''گرم مزاجی'' وغیرہ۔ اور غور کیا جائے تو ان کے مفہوم میں بھی اشارہ کائنات کے عناصرِ ترکیبی اور جسمانی اخلاط کے تعلق کا ہی ملتا ہے۔ یعنی آگ کا بنا ہو مزاج۔ یا گرم مزاج۔ ہم یقیناً ان ہی مزاجوں کو کہتے ہیں جن کا تعلق ان صفات کے متعلقہ اخلاط یا Humours سے ہے۔ یہی اشارے خشک مزاجی اور رقیق القلبی جیسی ترکیبوں میں بھی ملتے ہیں۔

اس نوع کی نفسیات کے بیان سے مزاجی نفسیات کی اہمیت کا اندازہ تو یقیناً ہوتا ہے لیکن یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مزاجی ٹائپ شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ انسانی شخصیت جو مزاج کے احاطہ کار سے بہت زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہے، مزاج کے تصور کو اپنے اندر سمو تو سکتی ہے لیکن مزاج کی یکسر مترادف قرار نہیں دی جاسکتی کیوں کہ شخصیت کے اندر ان کے علاوہ اور بھی بے شمار عناصر اور خصوصیات شامل ہیں۔

شخصیت کے دائرہ کار میں کردار شامل ہے لیکن کردار میں شخصیت جیسی پیچیدہ حقیقت کی سمائی نہیں ہوسکتی یعنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں کردار یقیناً ایک اہم پہلو ہے اور تعمیر شخصیت میں تشکیل کردار بھی شامل ہے۔ لیکن کردار تمام تر شخصیت نہیں ہے وہ شخصیت کے اس ہی پہلو کی ترجمانی کرسکتا ہے جس کا تعلق خوب و زشت کے پیمانوں سے ہے۔

اس طرح مزاج بھی شخصیت کے بہت بنیادی لواحق میں سے ایک ہے۔ مزاج کی نفسیات اور اس کی رُو سے شخصیت کے ٹائپوں کے بیان سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اول تو، کیونکہ مزاج کا تعلق جسمانی کیمیا، جسمانی ساخت، جذباتی ساخت اور ان سے پیداشدہ نفسیاتی تحریک سے ہے اس لیے مزاج ایک طرح سے شخصیت کی پیدائشی بنیاد تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن شخصیت کا کلّی مترادف نہیں۔ انسانی جسم کی کیمیا میں جو عناصر بالادست ہیں ان سے اگر اس کے نفسیاتی مزاج کا خمیر اٹھتا بھی ہے تو یہ عناصر محض شخصیت کے طبعی پیدائشی خواص کا تعین کریں گے لیکن انسانی زندگی کے ان گوناگوں تجربات اور اس پر ان بے شمار اثرات کا احاطہ نہیں کرسکتے جو زندگی میں وہ حاصل کرتا ہے اور جن سے شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مزاجی ٹائپ جس طور پر پیش کیے جاتے ہیں وہ '' ٹائپ کی شدید ترین شکل ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اتنی شدید یک طرفہ ٹائپ شخصیتیں کم ہی ہوتی ہیں جو ان چار ٹائپوں میں سے کسی ایک کا من و عن عکس قرار دی جاسکیں بلکہ بیشتر افراد میں ان چاروں مزاجی کیفیات کا اشتراک ہوتا ہے اور اس اشتراک کی بہت سی سطحیں ہوتی ہیں۔ ان مزاجوں کے اتحاد کے تناسب اتنے مختلف اور متنوع

ہو سکتے ہیں کہ محض مزاج کی رو سے بھی شخصیت کے ہزاروں ٹائپ وجود میں آسکتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم مزاج کو شخصیت کا ہم معنی لفظ سمجھیں تب بھی ہم ان چار ٹائپوں کی مدد سے صرف ان شخصیتوں کو کسی حد تک سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ان میں سے کسی ایک ٹائپ کی صحیح اور کلی نمائندہ ہوں لیکن ان شخصیتوں تک رسائی ممکن نہیں (اگر ہے بھی تو بہت دشوار ہے اور بڑی حد تک قیاس آرائی پر مبنی ہے) جن کے خمیر میں ایک سے زیادہ اخلاط کا مختلف تناسب سے اشتراک ہے۔

مزاج شخصیت کو سمجھنے میں اس حد تک رہنمائی کرسکتا ہے کہ ہم کسی فرد کی شخصیت کے ان طبعی پیدائشی عناصر کو سمجھیں جن پر آئندہ نشو و نمائے شخصیت کا انحصار ہوگا۔ کیوں کہ تعلیم و تربیت اکتساب اور ماحول کے اثرات سے انسانی شخصیت کی تعمیر تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کی بنیادی فرد کے مزاج کے نمایاں اور قوی عناصر پر ہی رکھی جاتی ہیں یہ عمل کوئی اختیاری اور شعوری عمل نہیں ہوتا بلکہ شخصیت اپنے نشو و نمائی مدارج میں ان ہی سمتوں میں جھکتی ہے جن کو ان کے مزاج سے نسبت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بے حد بلغمی مزاج کے شخص کی بہت سی خصوصیات ماحول کے اثر اور تعلیم و تربیت سے بنیں گی۔ ذہنی استعداد سے متاثر ہوں گی وغیرہ، لیکن شاید اس کو اس کے مزاج کی ضد میں بدلنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ مثلاً ایک مالیخولیائی فرد کو بہت مشہور و معروف پھرتیلا اور چابک دست کھلاڑی بنانا ممکن نہ ہوگا۔ اسی طرح سوداوی مزاج کا ایک شخص شاعر و فلسفی تو بن سکتا ہے یا پھر ایک محض گوشہ نشیں دلگیر قسم کے فرد کی زندگی گزار سکتا ہے لیکن اس کو بہت بے حس بے اصول بہت زیادہ باعمل سیاسی لیڈر بنا دیا جائے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مزاج شخصیت کی عمارت میں اس کی بنیاد کی خشتِ اول ہے لیکن تمام عمارت نہیں۔ عمارت کا طول و عرض حسن و خوبی، ڈیزائن افادیت اور تکمیل، خشتِ اول کے علاوہ اور بھی بہت سے تعمیری ساز و سامان اور سلسلوں پر ہوتی ہے۔ لیکن خشتِ اول کی اساسی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ جس کی مثال اس مشہور فارسی شعر سے بھی دی جاسکتی ہے۔

"خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج"

اگر خشتِ اول ہی کج ہے تو عمارت کی دیوار ثریا کی بلندیوں تک ٹیڑھی ہی جائے گی۔

□□□

بوسکی کا پنچ تنتر (پانچ حصوں میں)

مصنف: گلزار

"پنچ تنتر" کو ہندستانی ادبیات میں بے حد اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی کہانیاں دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ جناب گلزار نے اس کتاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم رکھی ہے تا کہ بچے انھیں دلچسپی سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 120، قیمت مکمل سیٹ: -/150 روپے

بوسکی کے کپتان چاچا

مصنف: گلزار

گلزار کے قلم سے بے حد آسان اور عام فہم زبان میں بچوں کے لیے ایک ایسی کہانی جس سے باتوں باتوں میں کافی معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

صفحات: 68، قیمت: -/55 روپے

تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو و نما پا کر ابھر سکیں، ان کی فطری نشو و نما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ظہیر الدین ملک ہماری مطبوعات "ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورّخین" سے اقتباس

اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فنِ تاریخ نگاری

اٹھارھویں صدی کے دوران تاریخی مضامین عام علمی تربیت کا ایک لازمی جز تھے۔ گو تاریخ کو اعلیٰ تعلیم کے نظام میں باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا، لیکن فطرتِ انسانی سے تعلق رکھنے والے مضامین پر اس کا بڑا اثر تھا۔ کیونکہ اس کا مطالعہ ذہن کے لیے بڑا محرک ثابت ہوتا تھا۔[1] چنانچہ اس دور میں مورّخین نے بہت کچھ لکھا۔ باقاعدہ سیاسی تاریخوں کے علاوہ بہت سے انتظامی رسالے نیز کاروبار اور تجارت پر کتابیں تالیف کی گئیں۔[2] دستاویزوں میں دلچسپی کے باعث بہت سے مکتوبات اور تاریخی اہمیت کے دیگر مجموعے تالیف کیے گئے۔[3] یہاں تک کہ مورّخین نے صنفِ نظم کو بھی نہ چھوڑا اور منظوم تاریخیں بڑی تعداد میں لکھی گئیں۔[4] اس ادب کے علاوہ امیروں اور صوفیوں کی سوانحیں اس دور کی عظیم الشان اور فاضلانہ دین ہیں۔[5] اہم ترین چیز، جس کی وجہ سے اٹھارھویں صدی خاص طور سے باعثِ دلچسپی بن گئی، وہ عظیم مذہبی ادب ہے جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تصوّف پر نامی گرامی کتابیں شامل ہیں۔[6] سماجی زندگی کے مختلف پہلو اور تہذیب کے مختلف رخ سمجھنے کے لیے شاعروں کے دیوانوں اور تذکروں سے بڑی مفید معلومات ملتی ہیں۔ لہٰذا اس دور کی تحریریں تنوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑی پُر اثر ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے شاید کسی اور دور میں مذہبی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر اتنا زیادہ ادب تیار نہیں ہوا جتنا اٹھارھویں صدی میں ہوا۔[7]

زیرِ نظر دور میں مورّخین کا خاص موضوع سیاست تھا، اور غیر مذہبی انداز کے مضامین کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ اپنی کتابوں میں فوجی مہموں، میدانِ جنگ کے کارناموں اور شاہی دربار کی رنگارنگ سرگرمیوں پر خاصا وقت صرف کرتے تھے۔ انتظامی کام، افعالِ جود و کرم نیز فن اور ادب کی سرپرستی کی تفصیلات بھی ان کے لیے جاذبِ توجہ تھے۔

خفی خاں نے سرتاپا ایک سیاسی تاریخ لکھی اور معلومات فراہم کرنے کے لیے وہ دربارِ شاہی کے چکّر کاٹتا رہا۔ اس کی کتاب واقعات کی ایک نمایاں تخلیقِ نو ہے، جو اسلوبِ بیان کے اعتبار سے واضح اور تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے بڑی منظم ہے۔ اسے واقعات کا بڑا علم ہے، اور اس کے پاس موضوعات بھی بہت ہیں۔ مغل تاریخ کے تسلسل کی بابت اس کا ایک تصور ہے اس کے علم و فضل کے علاوہ، اس کے ترتیبِ الفاظ اور اظہارِ بیان میں غیر معمولی حسن ہے۔ واقعات کو ایک وسیع سیاق سے وابستہ کرنے اور ماضی سے اسی انداز اور اسی قسم کی مثالیں دینے کا اسے ملکہ ہے۔ شاید وہی اکیلا مصنف ہے جو مختلف زبانوں میں کی جانے والی ان اصلاحات کا ایک جامع اور مربوط بیان دیتا ہے، جو اصلاحات منصب داری نظام کو ازسرِ نو منظم کرنے کے لیے کی گئی تھیں، جو نظام اپنے ہی وسیع ڈھانچے کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ رہا تھا۔[8] مرکزی انتظامیہ، مرہٹوں کے معاملات اور جاگیرداروں کی حالت پر اس کی تحریریں بے مثل ہیں۔ ان میں نہ صرف نئی معلومات شامل ہیں، بلکہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان معاملات پر مصنف کی کتنی گہری نظر تھی۔

بہادر شاہ کے دور میں مغل انتظامیہ کے اندر زوال کا جو عمل شروع ہو گیا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں تیموری حکومت کے قیام کے بعد سے ایک خطاب دو اشخاص کو نہیں دیا گیا، ہاں ایک دو صرف کے ردّ و بدل کی اجازت تھی۔ صفدر خاں بابی، جو اورنگ آباد میں تعینات تھا، اورنگ زیب کے زمانے سے ایک موروثی خطاب کا مالک تھا۔ لیکن بہادر شاہ نے یہی خطاب اپنے ایک پرانے ملازم کو عطا کر دیا۔ صفدر خاں نے اس خطاب کو برقرار رکھے جانے کی عرضداشت پیش کی جو اس سے بنا کسی نافرمانی کے چھن گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی درخواست پر" عطا کیا، عطا کیا،

●محب الحسن کی مرتب کردہ یہ کتاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شعبۂ تاریخ کی طرف سے منعقدہ ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے ہندوستانی دور وسطیٰ کے ممتاز مورّخوں کے رجحانات نیز ان کے طریقۂ کار کو سامنے لاتے ہیں اور دور وسطیٰ کے ہندوستان کو سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر محمد مجیب کے قلم سے ہے اور ترجمہ مسرور ہاشمی نے کیا ہے۔473 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 174 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

عطا کیا" لکھ دیا۔ حالانکہ وہی خطاب پہلے ہی ایک دوسرے شخص کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اسی دن سے یہ برا رواج بن گیا کہ ایک ہی خطاب دو یا تین اشخاص کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح، منصب، ہاتھی، جھنڈا؟ اور سرپیچ کی بخشش پانے والے کے رتبے اور وقار کے مطابق نہیں کی جاتی۔[9]

افسران خزانہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ انتظام مال تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور انھوں نے ایسی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جن کے ذریعے منصب داری نظام کو معیاری اور اثر آفریں بنایا جاسکے۔ انھیں توقع تھی کہ اصلاح کے بعد یہ نظام اس صورت حال پر قابو پالے گا۔ جس میں خرچہ آمدنی سے بڑھ گیا تھا، اور شہنشاہ بے سوچے سمجھے جاگیریں عطا کررہا تھا۔ حالانکہ اس مقصد کے لیے زمینیں کم تھیں۔ اخلاص خاں، اراض مکرر، جو اپنی دیانت داری اور محنت کی وجہ سے مشہور تھا، اس نے منعم خاں وزیر کی توجہ اس مالی بحران کی طرف مبذول کرائی جو ان مسائل کے باعث پیدا ہوا تھا۔[10] اس نے مشورہ دیا کہ منظوری سے پہلے تقرری یا ترقی کے لیے دی جانے والی درخواست کی جانچ پڑتال پہلے وزیر خود کرے۔

یہ یقینی تھا کہ اس انداز کی اصلاح کی مخالفت دربار کے وہ لوگ کریں گے جن کے حقوق اور اختیارات پر چوٹ پڑتی ہوگی۔ منعم خاں نے اس ڈر سے کہ عہدوں کے متلاشی لوگوں میں اس کی مقبولیت کم ہوجائے گی، یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا منظور نہ کیا اور اخلاص خاں سے کہا کہ اصلاح کا کام خود کرے۔ اخلاص خاں کو جب اپنے سے اعلا عہدیدار کی مدد اور اشتراک نہ ملا تو اسے لگا کہ یہ کام اس کے قابو سے باہر ہے۔ اس نے خود بھی ان اشخاص کے جذبات کو روندنے سے انکار کردیا جو حکومت میں مرتبے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

آخر میں ہر منصب دار کی ابتدا، منصب اور وقار کی تفتیش کا کام مستعد خاں کے سپرد کیا گیا، جو معاصر عالمگیری کا مصنف تھا۔ اس سے پہلے کہ ارض مکرر اور وزیر منصب داروں کی درخواستیں آخری منظوری کے لیے شہنشاہ کو بھیجیں مستعد خاں کو یہ ساری درخواستیں جانچنا اور تصدیق کرنا ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی ساری محنت رایگاں گئی۔ اصلاح کا یہ منصوبہ نہ صرف ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ناکام ہوا جو دولت کے متلاشی تھے بلکہ بہادر شاہ کی بے تکلفی کی وجہ سے بھی ہوا۔ امیدواروں کی جو درخواستیں مستعد خاں کے سامنے پیش ہونے سے پہلے شہنشاہ کی دو بیگمات، مہر پرور اور امتہ الحبیب شہنشاہ کے سامنے پیش کردیتی تھیں وہ ان پر دستخط کردیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کے دستخطوں کی اہمیت ختم ہوگئی۔ عالی جاہ اپنے افسروں سے کہتے کہ ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا راستہ نہیں رہ گیا کہ ہر امیدوار کے لیے جاگیر عطا کرنے کا فرمان جاری کردیں۔ اس کے افسران بہرحال، آزاد تھے کہ موقعے کی مناسبت سے جو بہتر سمجھیں وہ کریں۔"[11]

مقامی سطح پر انتظام مال کی بابت خفی خاں کا علم معتبر لگتا ہے، کیونکہ تحصیل وصول کا معاملہ اس کے عملی تجربے پر مبنی تھا۔ وہ عامل کی حیثیت سے خاصے عرصے تک حکومت کا ملازم رہا، حالانکہ وہ اس عہدے سے سخت متنفر تھا۔ وہ عاملوں کو بدخو، بدکردار اور ظالم کہتا ہے۔ افسر مال حکومت کی رقم پر ناجائز تصرف کرتا ہے اور مجبور کاشتکاروں کو لوٹتا ہے۔ مصنف خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کسانوں پر ظلم کیا اور مسلمانوں کی جائداد و املاک تباہ کی۔ اس کے نزدیک کتے ہانکنا اور سور چرانا تحصیل وصول سے بہتر کام ہیں۔[12]

افسران مال کی زیادتیوں پر لعنت بھیجنے کے علاوہ، خفی خاں دوسرے افسروں کو بھی مورد الزام ٹھہراتا ہے، جنھوں نے بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال پر کاشتکاروں کی حالت بہتر بنانے پر، نئی آبادیاں بسانے پر، اور زمینوں سے آمدنی بڑھانے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں اجارہ داری یا زراعت برائے آمدنی کی وہ لعنتیں بتائی ہیں جن کی وجہ سے رعیت پریشانی میں مبتلا ہوکر مٹی میں مل گئی اور دیہات ویران ہوگئے۔ وہ بڑے تیکھے انداز میں امیروں پر تنقید کرتا ہے جو ضرورت مندوں کی ذرا مدد نہیں کرتے، بس اپنی ذات میں محبوس رہتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔[13]

انتظامی تفصیلات نیز کاروبار اور تجارت کے بیانات پر مشتمل ایک کتاب مرات الحقائق ہے۔[14] اس کا مصنف اعتماد علی خاں بن اعتماد خاں عالمگیری، احمد آباد کا باشندہ تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ یہ ضخیم کتاب مرات احمدی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ روزمرہ کے ان واقعات اور خبروں کی بیاض ہے جن کا تعلق گجرات اور دارالسلطنت دہلی سے تھا۔ یہ کتاب ایسی تفصیلات کی ایک کان ہے جن کا تعلق ملک کے مختلف حصوں میں رائج قیمتوں سے، اور بعد کے مغلوں کے دور میں حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے ہے۔ مرات احمدی کے برعکس، اس کتاب میں نہ صرف گجرات کے اقتصادی حالات کا ذکر ہے، بلکہ دہلی، آگرہ اور الہٰ آباد کا ذکر بھی ہے۔ اس کا مصنف مختلف ابواب میں ان اسباب کی تشریح کرتا ہے جن کے باعث منصب داری نظام ٹوٹ گیا۔ ان منصب داروں کے حالات کا بڑی وضاحت کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے جن کے پاس یا تو جاگیریں نہ تھیں یا جو اپنی زمینوں پر اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔

اس دور کے مورخین کو خیال تھا کہ وقت کی راہ سفر چند منتخب لوگوں کی تعریف و ستائش کرکے اور ان کی تصویروں پر مبالغے کی رنگ آمیزی کرکے بیان کی جاسکتی تھی۔ ان کے نزدیک قلیل تاریخ کی کنجی ان افراد کے عروج و

زوال میں پوشیدہ تھی جنھوں نے سیاسی معاملات کی راہ متعین کرنے میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا۔ بادشاہ یا امیر سارے واقعات کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ سماج کے مختلف طبقے وقت کے اندھیرے میں پھینک دیے گئے تھے۔ حالانکہ یہ محققین مغل تمدن کی مادی بنیاد سے خوب اچھی طرح واقف تھے، پھر بھی یہ ان اقتصادی اور سماجی عنصروں کا تجزیہ نہ کرسکے جو مغل انحطاط کے اسباب میں شامل تھے۔

مغل حکومت کے زوال کے اسباب بیان کرتے وقت ان مورخین نے عام طور پر ان چند امرا کی اخلاقی اور سماجی پستی پر زور دیا جو کاہل اور مطمئن بالذات ہوگئے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتتے تھے۔ مثال کے طور پر، شاہ نامہ دکن کا مصنف احسن ایجاد[15] طبقۂ امرا کے کردار پر تنقید کرتا ہے اور اس کے زوال کا تعلق سیاسی قوت کے انحطاط سے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاہ نامہ دکن میں انتظامیہ اور جنگوں کے بارے میں اس کا بیان گو سرسری ہے لیکن بے لاگ اور درست ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی بداطواری اور عیش پسندانہ زندگی پر، امرا کی گٹ بندی اور رقابت پر، اور مغل حکومت کے دشمنوں سے نپٹتے وقت ان کے بزدلانہ برتاؤ پر طیش میں آجاتا ہے۔ وہ سپاہیوں، چھوٹے منصب داروں اور کم تنخواہ والے ملازموں کی مفلسی اور مصائب کی بھیانک تصویر پیش کرتا ہے، اور وہ باعزت اور تعلیم یافتہ لوگ اس تصویر میں شامل ہیں جو اپنی روزی کے واسطے حکومت کی سرپرستی پر تکیہ کرتے تھے۔

جب مرہٹوں نے دو اہم اور زرخیز صوبوں، گجرات اور مالوہ، پر قبضہ کرلیا، تو تحصیل وصول کرنے والے چھوٹے افسران اور ملازمین کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہوگئی۔ سیاسی مسائل پر بحث کرتے وقت احسن ایجاد مرہٹوں اور اندرونِ سلطنت دوسری تفرقہ انگیز قوتوں کے خلاف ایک نمایاں اور موثر حکمتِ عملی کی حمایت کرتا ہے۔ دوسرے مصنفین کی طرح، یہ بھی راجہ جے سنگھ کے رول پر ملامت کرتا ہے جس نے مرہٹوں کی بات مان لی، اور جو خاصے وسائل کے باوجود شاہی مقبوضات کو مرہٹوں کی یورشوں سے بچانے میں ناکام رہا۔

لیکن سیاسی، سماجی اقتصادی قسم کے پیچیدہ مسائل کا اس نے جو تجزیہ کیا ہے اس تجزیے میں بصیرت اور گہرائی کم ہے۔ جو کچھ گزرا اس کے اسباب وہ بڑی سادگی سے دے دیتا ہے، لیکن اس کی تفتیش سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جو تاریخی عمل رونما ہوئے ان کے پیچھے کیا مقصد تھا یا کیا معقولیت تھی۔ وہ کاشتکاروں کی حالت پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہے اور ان برائیوں کی تشریح نہیں کرتا جو مغلوں کے فوجی نظام میں داخل ہوگئی تھیں۔

چونکہ یہ زمانہ سیاسی انحطاط اور اقتصادی پریشانی کا زمانہ تھا، اس لیے تاریخ کی ساری عصری تحریروں پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس دور کے مورخ شاذ ہی ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو خطیبانہ اور آراستہ پیراستہ ہو۔ وضاحت اور سادگی اس مقصد کے حصول میں ان کی مدد کرسکتے تھے جو ان کے ذہن میں تھا۔ ان کا تصور تاریخ ان اخلاقی نصیحتوں پر مبنی تھا جس نے لوگوں کی تہذیب اور نظریات پر اثر ڈالا تھا۔ یہ مورخین ماضی سے منتخب کرکے ایسی مثالیں دینا پسند کرتے تھے جن کا مقابلہ اس صورتِ حال سے کیا جاسکے جس کا سامنا بادشاہ اور امرا کر رہے تھے۔ واقعاتِ ماضی سے اخذ کیے ہوئے اخلاقی سبق شاہوں اور سیاسی مدبروں کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔[16] وہ تاریخ کی تشریح اس انداز سے کرنا چاہتے تھے جیسے تاریخ نیک و بد کے درمیان ہونے والی کشمکش ہو۔ یہ گویا فلسفہ بالمثال کی تدریس تھی، کیونکہ جن لوگوں نے انصاف اور عوامی بہبود کے بنیادی اصولوں کی پیروی کی انھیں قوت اور ترقی ملی، اور جو لوگ اس راہِ مستقیم سے بھٹک گئے انھیں اذیت اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

بیشتر مورخوں نے اپنے زمانے کے واقعات خاص طور پر تحریر کیے۔ وہ یا تو دربارِ شاہی کے حاضر باش تھے یا پھر دارالسلطنت میں رہنے والے وزرا کے ملازم تھے۔ ان میں چند مورخ دور افتادہ صوبوں کے عہدیداروں اور صوبیداروں کے بھی ملازم تھے۔ اس طرح ان کے پاس وہ عمدہ ذرائع موجود تھے جن کی مدد سے مختلف واقعات کی بابت مناسب اور درست معلومات حاصل کرسکیں۔ جن واقعات کا انھیں براہ راست طور سے علم نہ تھا، ان کی بابت ان لوگوں سے معلومات حاصل کی جو عینی شاہد تھے۔ تاریخ ارادت خاں کا مصنف، ارادت خاں، اورنگ زیب کے زمانے میں پہلے جگنا کا اور پھر اورنگ آباد کا اور مانڈو کا فوجدار رہا۔ بعد میں شاہ عالم بہادر شاہ کے دور میں اسے دوآب کا صوبیدار مقرر کردیا گیا۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتا ہے: ''اپنے عہد کے سبب، اور چونکہ میں خود ان معاملات میں شامل رہا ہوں۔ اس لیے بیشتر واقعات کے ذرائع کا مجھے مکمل ہوگیا ہے، اور جن واقعات کی اطلاع بھی دوسروں کو بڑی مشکل سے ملے گی، ان کے منصوبے میرے سامنے بنے اور ان پر میری نظروں کے سامنے عمل درآمد ہوا۔ اور چونکہ میں سارے خطروں اور مصیبتوں میں شریک رہا اور دیکھتا رہا، اس لیے میں نے انھیں درج کرلیا۔''[17]

ان مورخوں کے پاس جو تاریخی مواد موجود تھا اسے تحریر کرتے وقت انھیں اپنے سے پیشتر کے مورخین کی کتابوں سے بڑی ہدایت ملی۔ سابق مورخین کی کتابیں بڑی تعداد میں ان مورخین کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ خفی خاں سچائی کا چونکہ پُرجوش حامی تھا اس لیے اس نے زور دیا کہ ہر شہادت کی مکمل تحقیق کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر مورخین کا یہ فرض ہے کہ وہ حقائق کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ تحریر کرے'' اسے (مورخ کو) یہ

نہیں کرنا چاہیے کہ ایک کا پاس کرے اور دوسرے سے دشمنی۔"[18]

مراتِ وریدات کا مصنف، شفیع وارید، دعوا کرتا ہے کہ اس نے وہ واقعات اور حادثات تحریر کیے ہیں جو یا تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا دوسروں سے سنے۔ اس نے بڑی کاوش سے دوسروں کے بیانات کی تفتیش کی اور جو بیانات پوری اور گہری چھان بین کے بعد غلط ثابت ہوئے انھیں رد کردیا۔[19]

ان موزخین نے جن طریقوں سے مواد اکٹھا کیا وہ طریقے عام طور پر دوسروں سے مختلف اور ان کے اپنے طریقے تھے، اور ہر چند کہ حقائق ایک ہی تھے لیکن ان کی ترجمانی مختلف تھی۔ یہ اختلافات مختلف صورتِ حال، مختلف سماجی پس منظر اور مختلف سیاسی مفاد کے باعث رونما ہوئے درباریوں اور امیروں کے گروہی جھگڑوں میں وہ کسی نہ کسی فریق سے وابستہ ہوگئے۔ اپنے سرپرستوں کے مفاد سے وابستہ ہوجانے کے سبب ان کا اندازِ فکر متاثر ہوگیا۔ لہٰذا، سیاسی قوتوں کے جوڑ توڑ کے بارے میں ان کی تشریحات اسی عنصر داخلیت سے متاثر ہوگئیں۔

اس سب مصنفین کا عقیدہ یہ تھا کہ تاجِ مغل ایک مقدس ادارہ تھا، جو ملک پر ہمیشہ حکومت کرنے کے لیے مقدر ہوچکا تھا، اور اسی بنا پر وہ حکمراں طبقے کی قوت اور استحکام کی علامت تھا، اور زمانہ سازوں نیز قوت فروشوں کی غارت گری سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی آخری ڈھال تھا۔ لیکن جس دور کی ہم بات کررہے ہیں، اس دور میں بادشاہ کی حیثیت گروہی سیاست کی بساط پر گھٹ کر ایک بے زور پیدل کی سی ہوگئی تھی۔ فرخ سیر کی معزولی اور وفات نے دکھادیا کہ بالآخر وزیروں اور امیروں کو شہنشاہ پر فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے مغل تاج داروں کو فنِ حکومت کی پوری تعلیم نہ ملی تھی۔ وہ اس خطرناک بحران کا مقابلہ نہ کرسکے جس سے مغل حکومت برابر دوچار رہی۔

جن عصری مصنفین نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ سلطنت ملکی جھگڑوں کا شکار ہورہی ہے اور اس کا عظیم ڈھانچہ بغاوتوں اور باہری حملوں کی لہروں کا سامنا کرتے کرتے بالآخر ٹوٹ رہا ہے، انھوں نے شہنشاہوں کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں اور ان کے برے ملکی انتظام پر لعنت ملامت کرتے وقت جھجک سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے فوجی مہموں اور ملکی انتظام کے بارے میں بادشاہوں کے نامناسب اور بے موقع اقدامات پر کھلم کھلا تنقید کی۔ حتیٰ کہ ان معاملات پر بھی سخت تنقید کی جن کا تعلق ان کی نجی زندگی سے تھا۔ بہادر شاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مستحق اشخاص کو قوت و اقتدار کے عہدے اور تحائف دینے میں بڑی فیاضی برتتا ہے۔[20] جہاں دار شاہ کو ایک اوباش شرابی کی تصویر میں پیش کیا گیا[21] اور فرخ سیر کو تلون کو غلام کہا گیا[22] محمد شاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آرام طلبی اور بے اعتدالی کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں رہ گیا کہ مطلبی امرا کو قابو میں رکھ سکے۔[23]

اس کے باوجود موزخین کو امرا کا کوئی ایسا کام برداشت نہ تھا جسے نافرمانی کہا جاسکے۔ انھوں نے ان مقامی قائدوں کے خلاف کھل کر اپنی خفگی کا اظہار کیا ہے جنھوں نے اپنی قوت کے بل بوتے پر ان فوائد میں حصہ بٹانا چاہا جو سلطنت کے نام پر انھیں حاصل ہوسکتے تھے۔[24] مرکز اور صوبوں کے درمیان ہونے والی برتری کی جدوجہد میں موزخین دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ موزخین مرکز سلطنت کے پرجوش حامی ہیں اور کچھ دوسرے موزخین مقامی سرداروں اور صوبیداروں کی حمایت کرتے ہیں۔ جن موزخین نے اپنی تاریخیں دکن میں تالیف کی ہیں جیسے قاسم اورنگ آبادی، معاصر نظامی کا مصنف، منسارام، تاریخِ فتحیہ کا مصنف۔ یوسف محمد خاں نیز کچھ اور موزخین انھوں نے مرکز سے تصادم کے معاملے میں نظام الملک کی حمایت کی۔ لیکن آشوب، رستم علی، شفیع جاوید، مرزا محمد جیسے مصنفین نے مرکزی نقطۂ نظر کی تائید کی۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ وہ تاجِ محل کے وفادار تھے، اس شخص کے نہیں جو اسے پہنتا تھا۔

حکمراں طبقے نے ذہنی تھکاوٹ اور تخلیقی قوت کی کمی کا اظہار کیا۔ شاہانِ مغلیہ کی خدمت کے پرانے جذبے کی جگہ ریاست کے خودغرضانہ استحصال نے لے لی۔ بڑے بڑے امرا نے جملہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر قبضہ کرلیا، بڑی بڑی زمینیں جاگیروں کی شکل میں اپنالیں اور شاہی قوت کی جڑ کاٹ دی۔[25] چھوٹے منصب دار ذلت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے لگے۔[26] امرا کا ایک نیا طبقہ جو خاندان یا لیاقت کی بنیاد پر کوئی حقوق طلب نہ کرسکتا تھا عروج پاکر قوت اور امتیاز کے مقامات پر پہنچ گیا۔[27] جتھے بند اور بداطوار امرا وقت کی چنوتیوں کا سامنا کرنے میں سخت ناکام رہے۔ سماج کے وہ منتخب حضرات جو سیاسی ذہن رکھتے تھے غفلت کی نیند سوتے رہے اور پورے دور حالتِ جمود میں رہے۔ ان کا ذہن مریض، نظر کوتاہ اور اخلاقی کیفیت برباد ہوگئی اور پورے طبقے کی ساری انفرادیت ختم سی ہوگئی۔ طبقۂ امرا کا گروہوں میں تقسیم ہوجانا، عوام سے علاحدگی اختیار کرلینا اور فلاحِ عام سے لاپرواہی برتنا، ان سب باتوں کی وجہ سے پورے طبقہ امرا کے زوال کے واسطے زمین ہموار ہوگئی۔

طبقہ امرا کے اس تنزل کو عصری مصنفین نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا ہے اور بعض اوقات بڑی سخت زبان استعمال کی ہے۔ مرہٹوں کے معاملات پر بحث کرتے وقت، شفیع وارید تحریر کرتا ہے کہ صوبۂ آگرہ میں پانچ سے سات ہزار ایسے منصب دار رہتے تھے جن کے پاس بڑی فوجیں تھیں۔ اسی علاقے میں بہت بڑی تعداد ایسے زمینداروں کی تھی جن کے پاس خاصے لوگ اور ساز و سامان تھا۔ لیکن یہ سارے منصب دار اور زمیندار صوبۂ آگرہ

کے گاؤں اور شہروں کو مرہٹوں کو لوٹ مار سے نہ بچا سکے۔[28] حدیقۂ نادرشاہ کا مصنف لکھتا ہے کہ: ''حکومت کے معاملات بگاڑ دیے گئے تھے۔ شہنشاہ کے وزیروں نے، جیسے قمرالدین خاں اور خانِ دوراں جو اعلا رتبوں اور دولت کی فراوانی کے باعث غرور کے نشے میں چور تھے حکومت کے معاملات کو نظرانداز کیا تھا۔ وہ آرام طلب تھے، کوئی ان کی عزت نہ کرتا تھا۔ نہ خود وہ بادشاہ سے خائف تھے، اور برے کاموں میں ملوث رہنے کے علاوہ ان کا کوئی کام نہ تھا۔''[29]

ایک ایسے ماحول میں جو گروہی جھگڑوں سے پر تھا۔ موزخین مجبور ہوگئے کہ اپنے گروہ کے قائدوں پر نظر رکھیں، اپنے سرپرستوں کی طرف داری کریں اور ان کے دعوؤں کی تائید کریں۔ اس جانبدارانہ سیاست نے ان کا صحیح ادراک ختم کردیا اور ان کے افق خیالات پر پردہ ڈال دیا۔ تاریخ کا کینوس سمٹ کر اس معمولی مباحثے تک محدود ہوگیا کہ حکمراں جماعت میں کون سا گروہ کسی شخص یا گروہ کے ساتھ ہے۔ اس مباحثے کا پوری سماجی زندگی کے وسیع تر پہلوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ گھٹ کر محض مجموعۂ حقائق بن گئی جس کو سیاسی رسالوں کی طرح پڑھا جاتا اور اسے امرا کے کسی ایک گروہ کے مفاد میں حکمراں طبقے کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف ایک موثر حربے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ حق کی چھان بین اور تاریخی مواد کی فراہمی اور استعمال کی اہمیت سمجھنے کے واسطے جس تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں کم تھا۔

اس مشاہدے کی وضاحت کے لیے تین مخصوص مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ نزاعی مسائل کی ترجمانی کتنے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ یہ مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں:

(i) فرخ سیر اور سیّد برادران کے درمیان تصادم

(ii) مغلوں اور سادات بارہا کے درمیان حصولِ قوت کے واسطے مقابلہ

(iii) ہندوستان پر نادرشاہ کے حملے کے وقت مختلف امرا کا رول

ان مخصوص مسائل کا تنقیدی مطالعہ ہمیں یہ طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے کہ ہمعصر موزخین کے ذہن کن تعصبات سے متاثر ہوئے۔

(I) فرخ سیر اور سیّد برادران کے درمیان جو طویل تصادم ہوا، اس کے باعث شاہی دربار پر مستقل خوف اور بے چینی چھائی رہی۔ اپنی بقا کے واسطے سخت مقابلے میں مصروف رہنے کے باعث شہنشاہ اور اس کے وزیروں نے ملکی انتظام کی طرف توجہ نہ دی اور ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بنانے میں منہمک رہے۔[30] ہوشیاری اور استقلال کی ملی جلی حکمت عملی کی بنا پر سیّد برادران نے اپنا اثر قائم کرلیا اور سارے معاملات کو پورے طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اٹھارھویں صدی کے موزخین جب ان عظیم واقعات کو تحریر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ انتخاب حقائق اور ان کی ترجمانی کے معاملے میں ان کے رویے جدا جدا ہیں۔ مصنّفین کی ایک جماعت سیّد برادران کے برے کاموں پر سخت تنقید کرتی ہے اور اس کے برعکس بعض دوسرے مصنّفین حکومت کی ساری برائیوں کی مکمل ذمے داری فرخ سیر کے کاندھوں پر ڈالتے ہیں۔ سید برادران کی نافرمانیوں کے باعث، نیز حصولِ قوت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور انتظامی فرائض کی ادائیگی سے لاپرواہی کے باعث ان کا ذکر بڑی حقارت سے کیا جاتا ہے۔[31] اسی طرح فرخ سیر پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنے طاقتور وزیروں سے نپٹتے وقت اس نے کمزور اور ناپائیدار حکمتِ عملی اپنائی۔[32]

خفی خاں واضح طور پر یہ لکھتا ہے کہ سیّد عبداللہ اور حسین علی کو اعلیٰ فوجی اور مالی عہدے دے کر فرخ سیر نے سخت غلطی کی کیونکہ ان دونوں کو انتظامی امور کی نہ کوئی تربیت ملی تھی نہ اس کا انھیں تجربہ تھا۔[33] اس کے برخلاف قاسم لاہوری جو خود کو سادات کا غلام کہتا ہے، سیّدوں کا پرجوش حامی ہے اور شہنشاہ کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جس نے سیّدوں کے خلاف سازشیں کرکے اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر انھیں اپنا سخت مخالف بنالیا۔[34] مرزا محمد[35] اور شفیع وردید[36] کا بیان یہ ہے کہ سیّدوں کے عروج پر جب ایسے امرا کو حسد ہونے لگا جیسے میر جملہ جو مغل تھا اور خانِ دوراں جو ہندی نژاد مسلمان تھا تو انھوں نے پسِ پردہ سازشیں کرنے اور اپنے اختیارات برقرار رکھنے کا تہیہ کرلیا۔ ان امرا نے شہنشاہ کو وزیر اور میر بخشی کے خلاف اُکسایا، اور اس طرح دربار میں جھگڑے پیدا کردیے۔

فرخ سیر کا میر منشی، یحیٰی خاں کچھ اور باتیں بھی تحریر کرتا ہے جن کی وجہ سے بادشاہ اور وزیروں کے درمیان خلیج اور گہری ہوگئی۔ وہ لکھتا ہے کہ وزارت، صدارت اور دیوان کے عہدوں پر تقرری کے جو جھگڑے ہوئے ان کے علاوہ فرخ سیر اجارہ داری شروع کرنے اور جزیہ ختم کرنے کے سخت خلاف تھا۔[37] محمد آشوب پوری صورتِ حال کو ایک فرقہ پرست کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصادم کا سبب وہ پرانی دشمنی تھی جو مغلوں اور بارہا کے سیّدوں کے درمیان رہی تھی۔ اس کے بموجب، سیّدوں نے سارے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور مغل جو سلطنت کی پشت پناہ تھے، بے روزگاری اور مالی مصیبتوں کے شکار تھے۔[38]

تاریخ ہند جو نہایت مختصر اور جامع کتاب ہے، اس کا مصنف رُستم علی خاں دلیری کے اُن قابلِ دید کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جو حسین علی خاں نے انجام دیے۔ اس کی سخاوت اور صوفیوں نیز اہلِ علم کی کھلے دل

سے سرپرستی کی بھی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے۔[39] لیکن آشوب حسین علی خاں کی خوبیوں اور کارناموں کو نظرانداز کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ وہ بڑی کاوش کے ساتھ اس کے کردار کی خامیاں سامنے لاتا ہے۔[40] ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تقریباً سارے ہی مورخین مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے معاملے میں حسین علی کی اس مصالحانہ پالیسی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جس پر وہ عمل پیرا رہا۔ ان کی تحریروں سے سیدوں کے خلاف تعصب ظاہر ہوتا ہے اور سیدوں نے زمینداروں اور علاقائی سرداروں کے معاملے میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اسے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ درست سہی کہ انھوں نے مقامی حکمرانوں سے جس انداز کے روابط قائم کیے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ فرخ سیر سے کسی کا کوئی تعلق نہ رہے، لیکن اس حکمتِ عملی کی بنا پر بالواسطہ ان علاقوں میں شاہی اقتدار کا بول بالا ہوا، جن علاقوں میں جھگڑے فساد کا دور دورہ تھا۔

جب فرخ سیر کو شرمناک انداز میں معزول کیا گیا اور اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا تو سیدوں کے خلاف غم و غصے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں ان پر نہ صرف غیر مطمئن امرا برہم ہوئے بلکہ سماج کے ادنا طبقے بھی طیش میں آ گئے۔[41] فاتح وزیروں نے مغل تاج کی بے عزتی کی، سرکاری عہدے اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے بھر دیے، اور معزول بادشاہ کی ذات پر سختیاں ڈھائیں۔ ان مورخین کے رویے بھی یک لخت بدل گئے جو اس سے پہلے تک سیدوں کو حق بجانب ٹھہراتے تھے، اور وہ ان کے برے افعال پر لعنت ملامت کرنے کے لیے سخت زبان استعمال کرنے لگے۔ یہ بات میر قاسم لاہوری[42] اور محمد قاسم اورنگ آبادی[43] پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔ فرخ سیر کی کمزور اور غیر مستقل حکمتِ عملی کے بارے میں اپنے سابقہ مشاہدات کے برخلاف، ان مصنفین نے ان طریقوں کی مذمت شروع کر دی جو سیدوں نے اختیار کیے تھے۔

(ii) ایک اور اہم معاملہ جس پر راویانِ واقعات ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، اقتدارِ اعلیٰ کے واسطے وہ سخت جدوجہد ہے جو مغلوں اور سیدوں کے درمیان ہوئی۔ حکمراں جماعت کے دو گروہوں کے درمیان مفادات کے اس ٹکراؤ کی وجہ تسمیہ، اس کی وسعت اور نوعیت سمجھنے کے لیے اس بات کی تشریح کرنا ضروری ہے کہ مورخ خود کن گروہوں سے وابستہ تھے، ان کے تعلقات اور تحریکِ ذہنی کے ذرائع کیا تھے جن سے ان کے نظریات متاثر ہوئے۔ بیشتر کتابیں محمد شاہ یا نظام الملک کی سرپرستی میں لکھی گئیں، جو مغلوں کے تسلیم شدہ قائد تھے۔ مثال کے طور پر خفی خاں نے محمد شاہ کے دور میں اپنی کتاب مکمل کی، اور وہ لمبے عرصے تک نظام الملک کے تحت ملازم رہا۔ محمد بخش آشوب مغل تھا، اور اقتدار کی جدوجہد کا بیان مغل نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ آبادی احسن ایجاد، یوسف محمد خاں، نیم خاں اورنگ آبادی،[44] حلسارام اور دوسرے لوگوں نے اپنے روزنامچے اس زمانے میں تالیف کیے جب نظام الملک کا آفتابِ اقتدار نصف النہار پر تھا۔

یہ مصنفین، دکن میں حکومت کے ملازم ہونے کے ناطے، اس نظام الملک سے ذاتی وفاداری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، جو ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سیدوں کے پاس ایسے چند ہی مورخین ہیں جو ان کے معاملے کی وکالت کر سکیں۔ سیدوں کے حمایتوں کی فہرست میں شاید رستم علی خاں اور غلام حسین طباطبائی[45] آ سکتے ہیں۔ ان مختلف راویوں پر غور کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے:

''فرخ سیر کے زمانے میں لوگوں نے ایک یا دوسری جانب وہ جانبداری یا دشمنی دکھائی ہے۔ جس کا کوئی حد وحساب نہیں، ان کی نظر اپنے فائدے یا نقصان پر رہی ہے، اور اپنے اسپ تصور کو اسی کے مطابق موڑ دیا ہے۔ ایک جانب کی ساری خوبیوں کو غلطیوں میں بدل دیا ہے، اور دوسری جانب کی غلطیوں سے آنکھیں موند لی ہیں۔''[46]

خفی خاں یہ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے کہ واقعات تحریر کرتے وقت اس نے دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے، پھر بھی نظام الملک کے واسطے اپنی ہمدردیوں کو چھپا نہیں پاتا۔ وہ اپنے سرپرست کی غلطیوں کی بے جا تاویلیں کرتا ہے اور اس کے دشمنوں کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظام الملک اس خیال کا مخالف تھا کہ سید برادران کو نمک بہ حرام اور حرام نمک کہا جائے۔[47] لیکن نظام الملک نے شہنشاہ اور اپنے دوستوں نیز ماتحتوں کو جو عرضداشتیں اور خطوط بھیجے ان میں سے ہر ایک میں اس نے ان دونوں بھائیوں کے لیے خود یہ کلمات نازیبا استعمال کیے۔[48]

(iii) یہ مورخین اس بات پر بالکل متفق نہیں ہیں کہ نادر شاہ نے 1738 میں ہندوستان پر جو حملہ کیا اس کی دعوت آیا سادات خاں اور نظام الملک نے دی تھی یا یہ کہ خانِ دوراں نے صورتِ حال بگاڑ دی اور ایرانی حملے کے سیلاب کی روک تھام کے لیے جو تیاریاں ضروری تھیں ان کی طرف سے سخت غفلت برتی۔ رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں کے گمنام مصنف اور جوہر صمصام کا مصنف ان دونوں اعلیٰ مغل امیروں پر کھلے طور پر غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے کابل اور لاہور کے صوبیداروں کی مالی امداد نہ کی جس کی وجہ سے شمالی مغربی سرحد کے دفاعی مورچے مضبوط نہ کیے جا سکے۔ اس نے ناصر خاں اور ذکریا خاں سے لاتعلقی برتی جس کے سبب بے حسی اور بیجا اطمینان کا ماحول بن گیا، شہنشاہ ایک غلط قسم کے احساس سلامتی سے مطمئن ہو گیا اور سرکاری

عہدیدار باہری حملے کا سامنا کرنے کے واسطے جو کوششیں کر رہے تھے وہ ختم ہو گئیں۔(50)

رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں اور جوہر سمسام بڑے رنگین اور مبالغہ آمیز انداز میں لکھی گئی تھیں، اور لگتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے سرپرست، خانِ دوراں، کی حیثیت بڑھانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے مخالفین نظام الملک اور سادات خاں نے کرنال کے میدانِ جنگ میں جو رول ادا کیا، وہ اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ قمرالدین خاں جو نظام الملک کا بھتیجہ اور وزیر تھا، اس کا دیوان آنند رام مخلص اور آشوب، جو مغل موقف کا سرگرم حمایتی تھا، یہ دونوں میر بخشی پر تہمتیں لگاتے ہیں اور اسے باہری حملے کے تباہ کن نتائج کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ امرا کے درمیان جو باہمی عداوتیں تھیں ان کے پیشِ نظر مورخین کے ان سارے بیانات کی بڑے غور سے جانچ کی جانی چاہیے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی براہِ راست یا اتفاقی شہادت نہیں ہے جو سادات خاں اور نظام الملک پر لگائے جانے والے غداری کے الزامات کی تائید کر سکے۔

حواشی:

1. نواب شاکر خاں، گلشنِ صادق، پٹنہ دستاویز، فولیو، d-44، نواب صدرالدین محمد خاں فیض، کلیاتِ فیض، بوڈلیان دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 122 تا 125۔
2. اعتماد علی، مراتِ حقائق، بوڈلیان دستاویز، مرزا محمد علی خاں، مراتِ احمدی، گیکواڑ اورینٹل سیریز، 1927، آنند رام، سیاق نامہ، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد لچھمی نرائن شفیق، حقیقت ہندوستان، آصفیہ دستاویز، حیدرآباد، جواہر لال بکس، دستور العمل بکس، علی گڑھ دستاویز۔
3. موسوی خاں جرأت، منشاتِ موسوی خاں، آصفیہ لائبریری دستاویز، حیدرآباد، منشی دیارام، بالمکند نامہ، پٹنہ دستاویز، صائب رائے، تحفہ کلام، بھگوان داس، عزیز القلوب، علی گڑھ دستاویز۔
4. نظام الدین، نادر نامہ، آصفیہ دستاویز، احسن ایجاد، شاہ نامہ دکن، آصفیہ دستاویز، میر رضا ذوالفقارہ شرف نامہ محمد شاہ، بی ایم دستاویز۔
5. کیول رام، تذکرۃ الامرا، علی گڑھ دستاویز۔ مرزا محمد، تاریخ محمدی، رام دستاویز، شاہ نواز خاں، معاصر الامرا، رستم علی خاں، تاریخ ہندی بی ایم دستاویز، خواجہ گل محمد، تکملہ سیر الاولیا۔
6. شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، الفرقان، بریلی، اسلامک کلچر، 1951 خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی 1953۔
محمد بخش آشوب نے 1781 میں لکھا تھا کہ اس دور میں فن تاریخ نویسی متروک ہو چکا ہے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے کثیر تاریخی ادب کی روشنی میں یہ بیان غلط لگتا ہے۔
تاریخ شہادتِ فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، بی ایم دستاویز، فولیو، 13۔
8. خفی خاں، منتخب اللباب، بب، اڈ، کلکتہ، 1874 جلد دوم، صفحات 800، 789۔
9. ایضاً جلد دوم، صفحات 627 تا 628۔
10. معاصر الامرا، جلد اول، صفحات 350 تا 352۔
11. منتخب اللباب، جلد دوم، صفحہ 630
12. ایضاً جلد دوم صفحہ 677
13. ایضاً جلد اول، صفحات 157 تا 158۔ ایضاً جلد دوم، صفحات 600 تا 769۔
14. اعتماد علی خاں، مراتِ حقائق، بوڈلین دستاویز سیتامئو روٹوگراف۔
15. احسن ایجاد فرخ سیر نامہ کا بھی مصنف ہے، جس میں محض فرخ سیر کے زمانے کی سیاسی تاریخ کا ذکر ہے، بی ایم دستاویز گر-25 (ریو-1273)
16. میر محمد قاسم اورنگ آبادی، احوال خواتین، بی ایم دستاویز، فولیو-103 تا 105۔
17. ارادت خاں، تاریخ ارادت خاں، علی گڑھ دستاویز، فولیو-2، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد-3، ہفتم، صفحہ 535۔
خفی خاں اورنگ زیب کے دور میں سرکاری ملازم تھا۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو اسے نظام الملک کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے ذریعے معلومات کی بابت یہ الفاظ لکھتا ہے:
"جو میں نے خود دیکھا، جو ان لوگوں کی زبان سے سنا جو وقتاً فوقتاً فرخ سیر سے وابستہ رہے تھے، اور جو سیدوں سے سنا جو جنگ اور ضیافت میں اس کے شریک رہے تھے، اسے بڑی دیانت داری سے سپردِ قلم کر دیا ہے اور جب بیانات میں اختلاف معلوم ہوا تو حق تک پہنچنے کی سخت کاوش کی ہے۔"
منتخب اللباب، جل دوم، صفحہ 727، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ-44۔
18. منتخب اللباب، صفحہ-726۔
19. مراتِ واردات، علی گڑھ دستاویز، صفحہ-10۔
20. منتخب اللباب، جلد دوم، صفحات 601 تا 602، 627 تا 628۔ کامراج بن نین سنگھ۔ عبرت نامہ، بی ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 36a۔
21. نورالدین فاروقی، جہاندار نامہ، بی ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 36 تا 38، شیخ محمد معین، فرخ نامہ، بی ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 74 تا 75، 89۔
22. مرزا محمد، عبرت نامہ، پٹنہ دستاویز، فولیو 95 تا 96۔
23. یحییٰ خاں، تذکرۃ الملوک، بی ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو-1326۔
24. تاریخ شہادتِ فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، بی ایم دستاویز، فولیو 43a، مراتِ واردات، صفحات 644 تا 645۔
25. اس پہلو پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے، اسٹڈیز ان اسلام، دہلی جنوری-1955، صفحہ-33۔
26. احوالِ خواتین، فولیو-161، مراتِ حقائق، فولیو، 92a۔
27. منتخب اللباب، صفحہ-776، عبرت نامہ، کامراج، فولیو 46a، 54a۔
28. مراتِ واردات صفحہ-644۔
29. مراتِ واردات صفحہ-644۔
29. حدیقہ نادر شاہ، (گمنام)، آصفیہ دستاویز، فولیو 4a۔
30. کامراج، عبرت نامہ، فولیو 54a۔
31. احوالِ خواتین، فولیو 77a، تاریخ شہادتِ فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، فولیو 42a۔
32. مرزا محمد، عبرت نامہ، فولیو 102 تا 103۔ میر قاسم لاہوری، تاریخ سلطنتِ فرخ سیر، بی ایم دستاویز، فولیو 62a۔
33. منتخب اللباب، صفحہ 738۔
34. تاریخ سلطنتِ فرخ سیر، فولیو 16، 2a، 66b۔

35. مرزا محمد، عبرت نامہ، فولیو-30۔

36. مرات واردات، صفحہ-505۔

37. تذکرۃ الممالک، فولیو 122، 124۔

38. تاریخ شہادت فرخ سیر وجلوس محمد شاہ، فولیو 70a، 43۔

39. تاریخ ہندی، صفحہ-772۔

40. تاریخ شہادت فرخ سیر وجلوس محمد شاہ، فولیو 38، 42، 43۔

41. شاہ نامہ منور کلام، فولیو 316۔

42. تاریخ سلطنت فرخ سیر، فولیو 76، 77، 80۔

43. احوال خواتین، 88a، 145b، 152a۔

44. منیم خاں اورنگ آبادی، سوانح دکن، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد دستاویز۔

45. غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، (متن) کلکتہ، II، 1836۔ صفحات-21، 22، 30، 37 تا 39۔

46. منتخب اللباب، صفحہ 726۔

47. منتخب اللباب، صفحہ-940۔
خفی خاں مصطفے آباد دکن کے خالصہ محل میں فوجدار اور امین کے عہدوں پر فائز رہا۔ یہ محل برہان پور کے صوبیدار کے افسران نے تباہ کر دیا تھا۔ رعیت بھاگ گئی تھی اور کاشتکاری ختم ہو گئی تھی۔ خفی خاں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ محل دوبارہ بسایا اور تحصیل وصول کے لیے سپاہی بھرتی کرنے پر دولت صرف کی۔ 1718 میں دکن کے صوبیدار حسین علی خاں نے دہلی کی سمت کوچ کا ارادہ کیا، جہاں اس کی موجودگی نہایت ضروری ہو گئی تھی کیونکہ وزیر سید عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان تصادم ایک نازک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ حسین علی خاں نے توپ خانے کے خرچ کے لیے خفی خاں سے بیس ہزار روپے طلب کیے۔ چونکہ خریف کی فصل ابھی کٹی نہیں تھی، اس لیے خفی خاں مطلوبہ رقم فراہم نہ کر سکا۔ صوبیدار نے یہ رقم دوسرے ذرائع سے حاصل کی اور مورخ کو برخاست کر دیا۔ اس عہدے سے برطرفی جسے خفی خاں نے بڑی مشکلات کا سامنا کر کے حاصل کیا تھا، غالباً اس کے ذہن میں کھٹکتی رہی اور وہ حسین علی خاں سے بدظن ہو گیا۔ جلد دوم، صفحہ 798۔

48. منشیات موسوی خاں، فولیو 48، 51۔

49. رسالہ محمد شاہ وخان دوراں، گمنام، بی ایم دستاویز، فولیو 100، 103 تا 105۔ محمد محسن، جوہر صمصام، بی ایم دستاویز یا 1898، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہشتم، صفحہ-75۔

50. آنند رام مخلص، تذکرہ، علی گڑھ دستاویز، فولیو 119 تا 120، تاریخ شہادت فرخ سیر وجلوس محمد شاہ، فولیو 182 تا 184۔

□□□

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت :-/300 روپے

آندھی (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظر نامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت :-/65 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنفہ: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق وعمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق وعمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے — اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثبوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرد دیہ تحریک — یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت :-/120 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

صفدر امام قادری

سول سروس امتحانات کے لیے
اردو زبان وادب کی تیاری

ہر طالب علم کے دل میں یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اعلیٰ ملازمت اور مناصب تک پہنچے۔ اس کے لیے طلبہ مرکزی اور صوبائی مسابقتی امتحانات میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ ان امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ بہتر منصوبہ بندی اور مضمون کا انتخاب بے حد ضروری ہے۔

سول سروس اور صوبہ جاتی امتحانات کے پہلے مرحلے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد Mains کا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں دیگر مضامین کے ساتھ اردو بھی بطور اختیاری پرچہ شامل ہے۔ بہار، اترپردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، آندھراپردیش، جھارکھنڈ اور مغربی بنگال میں اردو ایک مقبول مضمون ہے اور سینکڑوں طالب علم ہر سال مرکزی اور صوبائی سول سروس امتحانات میں اردو مضمون منتخب کر کے کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔

پرچۂ اول

ذیل میں اردو مضمون منتخب کرنے والے طلبہ کے لیے چند اہم امور کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔ عام طور پر امیدوار ایک ساتھ کئی صوبائی اور مرکزی سطح کے مقابلہ جاتی امتحانات دیتے ہیں۔ جن کے نصاب میں اچھا خاصا فرق ہے۔ اس لیے طلبہ کو تیاری کرتے ہوئے مرکزی اور تمام صوبائی سروس پبلک کمیشنوں کے مشترکہ نصاب کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ بالعموم اردو زبان وادب کا نصاب دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ حصۂ اول زبان کے بارے میں موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اور حصۂ دوم ادب سے متعلق ہوتا ہے۔ پہلے پرچے میں آریاؤں کی ہندوستان میں آمد اور ہندوستان کے لسانی منظرنامے پر اس کے اثرات کے علاوہ ہند آریائی کے تین ادوار۔ قدیم، وسطی اور جدید کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ نصاب کا حصہ ہے۔ اس کے لیے سنیتی کمار چٹرجی کی ''ہند آریائی اور ہندی''،مسعود حسین کی ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو''، محی الدین قادری زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' معاون ہوسکتی ہیں۔

مغربی ہندی اور اس کی پانچ بولیوں برج، کھڑی، ہریانوی، قنوجی اور بندیلی کے ارتقا اور اردو سے ان کے رشتے پر آپ کی نظر ہونی چاہیے۔ اردو کے پنجابی، ہندی، عربی اور فارسی سے تعلق اور ایک دوسرے کو ان زبانوں نے کس حد تک متاثر کیا، اس کی معلومات بھی ہونی چاہیے۔ اردو کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔ خاص طور سے محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری وغیرہ کے نظریات کا انفرادی طور پر محاکمہ کیا جانا چاہیے کیوں کہ ان پر الگ سے کئی بار سوالات پوچھے جاچکے ہیں۔ گیان چند جین اور مسعود حسین خاں کی کتابوں کے علاوہ مرزا خلیل بیگ کی کتابیں ـــــ ''اردو کی لسانی تشکیل'' اور ''لسانی تناظر'' اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہوں گی اس کے علاوہ نصیر احمد خاں کی کتاب ''اردو ساخت کے بنیادی عناصر''، گیان چند جین کی ''عام لسانیات'' اور مرزا خلیل بیگ کی کتابیں طلبہ کے لیے مددگار ہوں گی۔

دکن میں اردو کے فروغ اور ارتقا کا موضوع مقابلہ جاتی امتحانات کے پرچۂ اول کی روح ہے۔ مختلف سلاطین کے دور میں اردو نے جو ارتقائی سفر طے کیا ہے، اس کے تاریخی گوشوارے کے ساتھ لسانی امتیازات سے بھی طالب علم کو واقف رہنا چاہیے۔ اہم دکنی شاعروں اور ادیبوں خصوصاً محمد قلی قطب شاہ، ملاوجہی اور ولی دکنی کی ادبی اور لسانی خصوصیات کی جانکاری کے علاوہ شمال میں اردو کے ابتدائی نقوش سے بھی طلبہ کو آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے طلبہ کو سید احتشام حسین کی ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی مرتب کردہ ''اردو ادب کی تاریخ''، نصیرالدین ہاشمی کی ''دکن میں اردو'' کے علاوہ مسعود حسین خاں اور مرزا خلیل بیگ کی متذکرہ بالا کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

پرچۂ اول کا دوسرا حصہ مختلف شعری اور نثری اصناف کے ارتقا کے ساتھ ادبی تحریکات اور ادبی دبستانوں کی تاریخی اہمیت کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ حصہ اردو کی ادبی تاریخ کا مطالعہ بھی ہے۔ شعری اصناف میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، نظم جدید، آزاد نظم اور نظم معریٰ؛ اور نثری اصناف میں داستان، ناول، مختصر افسانہ، ڈراما، ادبی تنقید، سوانح، مضمون، خطوط اور انشائیے شامل ہیں۔ اکثر سوالات ان اصناف کے تاریخی ارتقا اور مختلف مواقع سے ہونے والی تبدیلیوں یا رجحانات سے متعلق پوچھے جاتے ہیں۔ قدیم اصناف کے زوال یا عروج کے اسباب پر بھی سوالات قائم کیے جاتے ہیں۔ کئی بار

جدید اصناف پر مغرب کے اثرات یا مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں کے تناظر میں ان کا جائزہ لینے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اصناف کے ارتقا سے متعلق اردو میں مجملاً زیادہ کتابیں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں خلیق انجم اور قمر رئیس کی کتاب ''اصناف ادب اردو'' مختصراً معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔

پہلے پرچے کے دوسرے حصے میں چند ادبی تحریکوں کی تاریخ اور ان کے اردو ادب پر اثرات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اس حصے میں ایہام گوئی مع اصلاح زبان کی تحریک، فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک، نظم جدید، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ہندوستان کی جنگِ آزادی جیسی تحریکوں کے تناظر میں اردو ادب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو کی ادبی تحریکیں اور ڈاکٹر منظر اعظمی کی کتاب ''اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' اس سلسلے میں کارآمد کتابیں ہیں۔ اس حصے کی تیاری کے لیے سید احتشام حسین کی کتاب ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' اور عظیم الحق جنیدی کی ''اردو ادب کی تاریخ'' اہم ہیں۔

اردو کے ادبی مراکز پر مشتمل حصہ نصاب کے اعتبار سے مختصر ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں اردو ادب کے ارتقا کا تاریخی گوشوارہ تیار کرنے کے ساتھ ان کے ادبی اور لسانی امتیازات سے واقفیت ضروری ہے اور ان دبستانوں کے عروج اور زوال کے اسباب۔ اردو میں ادبی تنقید کا ارتقا اور حالی، شبلی، کلیم الدین احمد، سید احتشام حسین اور آل احمد سرور کی تنقید نگاری نصاب کا حصہ ہے۔ اس کے لیے ''فن تنقید اور تنقید نگار'' (نورالحسن نقوی) مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

پرچۂ دوم

دوسرا پرچہ طالب علم کی تنقیدی اور تجزیاتی استعداد جاننے کے مقصد سے شامل کیا گیا ہے۔ اس کے نثری اور شعری دونوں حصوں میں اردو کی اہم کتابیں شامل ہیں۔ مختلف صوبائی امتحانات دینے والے طلبہ کو اس پرچے میں اس وجہ سے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کہیں کتابوں کا ایک سیٹ ہے تو دوسری جگہ دوسرا سیٹ۔ اس لیے طالب علم کے لیے ایک وقت میں اچھی خاصی تعداد میں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوجاتا ہے۔ یونین پبلک سروس کمیشن، بہار اور اتر پردیش سول سروس کے نصاب کو ایک ساتھ کرلیا جائے تو نثر میں تیرہ کتابیں ہوجاتی ہیں۔ باغ و بہار (میرامن)، انتخاب خطوط غالب (مرتبہ خلیق انجم)، نیرنگ خیال (محمد حسین آزاد) آب حیات (محمد حسین آزاد)، امراؤ جان ادا (مرزا ہادی رسوا)، مقدمہ شعر و شاعری (الطاف حسین حالی)، گئودان (پریم چند)، واردات (پریم چند)، پریم چند کے نمائندہ افسانے (مرتبہ قمر رئیس)، غبار خاطر (ابوالکلام آزاد)، انارکلی (امتیاز علی تاج)، اردو تنقید پر ایک نظر (کلیم الدین احمد)، اپنے دکھ مجھے دے دو (راجندر سنگھ بیدی) اور آخر شب کے ہم سفر (قرۃ العین حیدر) جیسی کتابوں کا مطالعہ لازم ہے۔

دوسرے پرچے کے شعری حصے میں دس کتابیں شامل ہیں۔ ''انتخاب کلام میر''، ''قصائد سودا مع ہجویات''، ''سحرالبیان''، ''دیوان غالب''، ''کلیات شاد عظیم آبادی''، ''بال جبریل''، ''کلام فیض'' (نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ) ''روح کائنات''، ''گل نغمہ''، ''سیف و سبو'' اور ''بنت لمحات'' ہیں۔

بعض اہم ادبی شخصیات پر شائع شدہ رسائل کے کچھ خاص شمارے بھی بے حد کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں'' جامعہ اردو'' علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالے'' ادیب'' کے پرانے شمارے بے حد معاون ثابت ہوں گے۔ ان میں تمام اہم شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ادبی تحریکات و رجحانات اور دیگر اہم موضوعات پر مضامین مل جائیں گے۔ روح ادب (کلکتہ)، آج کل (دہلی)، ایوان اردو (دہلی) فکر و نظر (علی گڑھ) کے سرسید، حالی شبلی، نذیر نمبر، عصر آگہی (دہلی) کے راجندر سنگھ بیدی نمبر ''فن و شخصیت'' (ممبئی) کا فیض نمبر، زبان و ادب (پٹنہ) کا شاد عظیم آبادی نمبر، عصری آگہی (دہلی) اور نیا سفر (الٰہ آباد) کے جوش ملیح آبادی نمبر، آج کل (نئی دہلی) کا اخترالایمان نمبر اور جامعہ (دہلی)، انعکاس (مظفر پور) اور نیا دور (لکھنؤ) کے فراق نمبر گذشتہ دو دہائیوں میں منظر عام پر آئے ہیں اور عام طور پر کتب خانوں اور اصحاب علم کے پاس بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ طلبہ رسائل کے ان خصوصی شماروں سے اپنے کام کی چیزیں بہت کم وقت میں تلاش کرسکتے ہیں۔

تشریحات

زبان و ادب کے پرچے میں تشریح کا حصہ طلبہ کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی ایسی کوئی تربیت اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں مستقل طور پر نہیں ہوتی ہے۔ شاعری اور نثر دونوں حصے سے تشریح کے لیے اقتباسات دیے جاتے ہیں۔ شاعری میں متفرق اشعار کے علاوہ غزل یا نظم سے سات آٹھ مصرعوں پر مشتمل ٹکڑے بھی تشریح کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اشعار کی تشریح کے سلسلے میں تو کئی شرحیں کام آسکتی ہیں لیکن نثری متن کی توضیح و تشریح پر توجہ ہی نہیں دی گئی ہے۔

پرچۂ دوم میں تشریح کا حصہ 40 فیصد ہے۔ اکثر طلبہ اس میں اتنا کمزور مظاہرہ کرتے ہیں کہ ممتحن انھیں پچیس، تیس فی صد نمبر بھی بہ مشکل دے سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے کل نمبر کا تناسب غیر متوقع طور پر کم ہوجاتا ہے۔ عام طور پر طلبہ کی یہ شکایت ہوتی ہے کہ پہلے پرچے میں زیادہ نمبر آتا ہے اور

دوسرے پرچے میں کم۔ جب کہ ہر طالب علم کو یہ پتہ ہے کہ پہلے پرچے کا نصاب بے حد وسیع ہے۔ کوئی امیدوار آسانی سے اندازہ نہیں کرسکتا ہے کہ کس حصے سے کون سا سوال پوچھ لیا جائے گا۔ جب کہ دوسرے پرچے میں کتابیں اور مصنفین دونوں طے شدہ ہیں۔ ہمارے طلبہ کو تشریح کے حصے میں کافی کم نمبر آتے ہیں۔ اس لیے طلبہ کو اگر کامیابی حاصل کرنی ہے تو حصہ تشریح کو بہت مستحکم اور مضبوط بنانا ہوگا۔ میر، غالب، میرحسن، اقبال، فیض، فراق اور اختر الایمان کی شاعری اور باغ و بہار، غبار خاطر، خطوط غالب، گئودان، نیرنگ خیال اور اپنے دکھ مجھے دے دو کے اقتباسات کو روزانہ کی مشق کا حصہ بنانا ہوگا۔ کثرت مطالعہ سے طلبہ شاعر یا نثر نگار کے اسلوب، موضوعات اور لہجے کو پہچان کر آسانی سے شعر یا اقتباس کی تشریح کرسکتا ہے۔

لازمی سوالات

یو. پی. ایس. سی. اور اتر پردیش سول سروس کے امتحانات کے پہلے پرچے میں دو لازمی سوالات مختصر نوٹ کے تین حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ لازمی سوالات بھی چالیس فی صد حصہ لے لیتے ہیں۔ اس حصے میں بھی طلبہ کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر طلبہ تشریح اور لازمی سوالوں کے نقطۂ نظر سے مختصر جوابات لکھنے کی مشق کرنے لگیں تو اس صورت حال کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اپنی باتوں کو مربوط انداز میں لکھنے کی مشق ہونی چاہیے۔

سول سروس کے امتحانات لاکھوں امیدواروں میں سے تین چار سو کو منتخب کرنے کے مقصد سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس لیے نصاب کو کسی حصے کو دشوار سمجھ کر چھوڑ دینا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ موضوع کے تمام ممکنہ گوشوں سے واقفیت حاصل کرے۔ ارادہ بھی ہونا چاہیے کہ نصاب کے ظاہر اور بین السطور دونوں حصوں میں جو موضوعات ہیں، اپنی معلومات کا حصہ بنائیں۔ اس کے علاوہ اس سے متعلقہ امور سے بھی آگاہی حاصل کرنے میں فائدہ ہے۔ حیات جاوید پر 2000 میں یو. پی. ایس. سی. میں ایک سوال پوچھنے کا نصاب کے اعتبار سے صرف یہ جواب ہے کہ سوانح نگاری کو بطور صنف طالب علم کو پڑھنا ہے۔ اسی طرح "ضرب کلیم" کے ایک شعر کی تشریح کرنے کو کہا گیا ہے جب کہ "بال جبریل" نصاب میں شامل ہے۔ اب اسے نصاب سے باہر سمجھ کر بھی طالب علم کے لیے کیا چارۂ کار بچتا ہے۔ طلبہ کو میرا مشورہ ہے کہ وہ نصاب کے علاوہ بھی مطالعہ کریں۔

عام طور پر سول سروس کے امتحانات میں اردو مضمون رکھنے والے طلبہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل نہیں کی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی ابتدائی صلاحیت بس واجبی ہوتی ہے صرف ونحو کے ابتدائی اسباق میں بھی ایسے طلبہ اکثر گڑبڑا جاتے ہیں۔ اس لیے طلبہ اور ان کے اساتذہ دونوں کے لیے یہ ایک چیلنج ہوتا ہے کہ کم سے کم مدت میں یہ طالب علم موضوع سے کماحقہ، واقف ہوجائیں۔ اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اردو کے طلبہ کو مایوسی کے بجائے مطالعہ اور مشق کے اسلحے سے خود کو آراستہ کرنا چاہیے۔

Head, Deptt. of Urdu,
College of Commerce,
Patna-20 (Bihar)

□□□

بدھ کی کہانیاں

مصنف: اعجاز کھنہ

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80 قیمت: -/65 روپئے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی. ایل. ایل. جیاپردا، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیورائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

پنیت غیر، استوتی تریہان، سمراٹ شرما "C ایڈونچر" سے اقتباس

کیا آپ C ہیں؟

C سے متعلق

C کو بیل لیبوریٹریز کے ڈینس ریچی (Dennis Ritchie) نے 1972 میں ڈیولپ (develop) کیا تھا۔ چونکہ اس لینگویج (language) کو "B" کے بعد ڈیولپ (develop) کیا گیا تھا اس لیے اس کا نام C پڑا (B لینگویج شہرت نہ پا سکی۔) UNIX آپریٹنگ سسٹم کو دوبارہ لکھنے کے لیے ہائی لیول لینگویج (high level language) کے طور پر ڈیولپ (develop) کیا گیا۔ آج یونکس کے بیشتر سسٹم اور اس کے تحت چلنے والے زیادہ تر پروگرام "C" میں لکھے گئے ہیں۔

"C" کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ قابل اعتماد، سادہ اور استعمال میں آسان ہے۔ یہ بہت وسیع لینگویج (language) ہے مگر مسلسل مشقوں سے آپ اس لینگویج میں خاصے ماہر ہو جائیں گے۔ ہم ابھی مسلسل اس تحقیق میں لگے ہیں کہ "C" ہمیں کیا کیا دے سکتا ہے۔ "C" کو سمجھنے کے لیے مشق کی ضرورت ہے، صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں۔ بلکہ آپ کو ایک C compiler کو حاصل کرنا ہوگا اور اس کے بعد اپنے پروگرام کو اسے لکھ کر کے ٹیسٹ کرنا ہوگا کیونکہ انسان غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے۔

بنیاد

C کوڈ کے صحیح طریقے سے لکھنے کو سنٹیکس (SYNTAX) کہا جاتا ہے۔ سنٹیکس (SYNTAX) چند چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔

- C کے بنیادی الفاظ جیسے int, for اور return
- Constants اور Variable اور اس کے بعد بھی کچھ۔
- Operators جیسے + (arithmetic addition") 'II (logical "or") اور ("Address of operator") یاد رکھیے کہ C دوسرے لفظوں میں Case sensitive کہا جاتا ہے۔ کیپٹل حرفوں میں لکھنا برخلاف چھوٹے حروف کے فرق پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خالی جگہ (space) کے C پروگرام میں استعمال سے کمپائلیشن کے عمل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ پروگرام کو بہتر ریڈیبل (readable) بنانے کے لیے کتنی ہی بار خالی جگہ کا استعمال کر سکتے ہیں۔

پروگرام لکھنا (Programme Writing)

اپنے پہلے پروگرام کو لکھنے سے پہلے اپنے مقصد سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جس کی مثال ایک پنسل سے کاغذ پر لکھنے جیسی ہے۔ اگر آپ یہی نہیں جانتے کہ کیا بنانے جا رہے ہیں تو شروع کیسے کریں گے۔

مانا کہ اب ہم لفظ "Hello World" کے ذریعے پروگرامنگ کی دنیا کا استعمال کریں گے۔ ایسا کرنے کے لیے پروگرام نیچے دیا جا رہا ہے۔

[illegible]

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "C" ایڈونچر" سے اقتباس پیش ہے۔ اس کتاب کے ایڈیٹر وی۔کے۔گپتا، معاون ڈاکٹر راجیو گپتا اور اردو ایڈیٹر ڈاکٹر رویندر کمار ہیں۔

اب دیکھیں کہ آپ کے پروگرام کو کیسے کمپائل (compile) کر کے چلایا جائے گا۔

ہم ++Microsoft Visual C کا استعمال کر رہے ہیں اس لیے ہم بتائیں گے کہ اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے مگر کام شروع کرنے سے قبل Microsoft ++Visual C آپ کے کمپیوٹر پر انسٹال (instaled) ہونا چاہیے۔

++Start /Microsoft Visual Studio /Microsoft Visual C کے اوپر کلک کر کے آپ ++Microsoft visual C کے پیکیج کو کھول سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے فائل ٹیب (tab) سے ++C کو منتخب کریں اور فائل کا نام اس طرح داخل کریں۔ جیسے "Hello World.c" جس فولڈر میں آپ اس کوڈ کو رکھنا چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کریں۔ اس عمل کو پورا کرنے کے بعد ok پر کلک کریں۔ "Hello World" پرنٹ کرنے کے لیے مندرجۂ بالا کوڈ ٹائپ کریں۔ پھر File/Save کلک کر کے فائل کو محفوظ کر دیں۔ اب آپ پروگرام کے source code کو C میں لکھ چکے ہیں۔ چونکہ پروگرام کو آپ C میں لکھ رہے ہیں اس لیے فائل نام کو ایکسٹینشن '.c' میں محفوظ (Save) کرنا پڑے گا۔ اس فائل کو Source file کہا جاتا ہے۔

کوڈ کو لکھنے کے بعد اسے کمپائل (compile) کرنا ہوگا۔ کمپائلنگ سورس کوڈ کو مشین کی زبان (language) میں ترجمہ کرنے کے لیے کمپائل (compile) کیا جاتا ہے جسے کمپیوٹر سمجھ سکتا ہے۔ جس فائل میں مشین کوڈ ہوتا ہے اسے آبجیکٹ فائل (Object file) کہا جاتا ہے۔

اب آپ اپنے "Hello World" پروگرام کو کمپائل کرنے کے لیے "Build/compile Helloworld.c" کے اوپر کلک کریں۔

آپ کو ایک پیغام (message) ملے گا۔

Yes پر کلک کیجیے اور جاری رکھیں۔

اگر آپ نے خود کوڈ (code) کو بغیر غلطی کے ٹائپ کیا ہے تو آپ کو ونڈو (window) کی اسکرین پر پیغام (message) ملے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوڈ کو بغیر کسی غلطی کے بڑی کامیابی کے ساتھ کمپائل کیا گیا ہے۔ اب آپ .Build/HelloWorld.exe پر کلک کریں۔ اگر آپ کے کوڈ کے لنک صحیح ہیں تو اوپر دیے گئے پیغام کے جیسا ہی پھر ایک پیغام ملے گا۔ سورس کوڈ (source code) باہر سے کسی دوسری لائبریری کی فائل کو استعمال کر لیتا ہے اس لیے لنک دینا ضروری ہوتا ہے۔ کمپائلر سے ہوتے ہوئے کوڈ کو ایک LINKER کے اندر سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر سورس کوڈ (source code) لائبریری (library) یا آبجیکٹ فائل سے لنک (link) کرتا ہے جس سے بالترتیب کوڈ پیدا ہوتا ہے۔

اب آپ اپنے تمام عمل کا نتیجہ دیکھنے کے لیے Build/Execute Helloworld.exe پر کلک کیجیے۔

پروگرام کو سمجھنا (Understanding the Programme)

اب آپ نے اپنی کاوشوں کا نتیجہ دیکھ لیا میں اب پروگرام کو ٹکڑوں میں واضح کروں گا۔

انکلیوڈ ڈائریکٹیو (Include Directive)

اگر کوئی لائن # کے بعد شروع ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کمپائلر کو C Preprocessor کے پاس ایک کمانڈ بھیجنے کو کہہ رہا ہے۔ C Preprocessor ایک پروگرام ہے جو آپ کے پروگرام کو کمپائل ہونے سے پہلے چلاتا ہے۔ آپ جن C Preprocessor کے کمانڈ کو استعمال کرنے والے ہیں، Include # ان میں سے ایک ہے جو اس معینہ فائل کو دیکھتا ہے اور فائل کے متن (contents) اس کی جگہ رکھتا ہے۔ Include directive # موجود ہے اس طرح سے یہ کوڈ کو زیادہ پڑھے جانے کے قابل بنا دیتا ہے۔

ہیڈر فائلس (Header Files)

ہیڈر فائل (Header file) کی ایکسٹینشن .ایچ extension.h ہوتی ہے۔ فائل کا نام include directive # سے شروع ہوتا ہے ہیڈر فائل میں کچھ ایسی ڈکلریشن (declarations) ہوتی ہیں جو آپ اپنے پروگرام سے استعمال کر سکتے ہیں اور نہیں بھی کر سکتے مثلاً stdio.h فائل کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب printf یا scanf اصول (فنکشن) کو اپنے پروگرام میں استعمال کریں گے۔ ()printf فنکشن Double quote میں لکھے ہوئے متن (text) کو اسکرین پر پیش کر دیتا ہے۔

ہیڈر فائل کوشامل کرنے کے دو طریقے ہیں:

```
#include "stdio.h"
```

اور

```
#include<stdio.h>
```

اگر آپ Double quotation کے اشارے کو استعمال کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہیڈر فائل (header file) کو تمام دوسری ڈائریکٹریوں سے پہلے اس ڈائریکٹری میں تلاش کیا جائے گا جس میں آپ اس وقت کام کر رہے ہیں لیکن اگر آپ Angle bracket کا استعمال کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہیڈر فائل کو تمام ڈائریکٹریوں میں تلاش کیا جائے گا۔

خاص () اصول (Main ( ) Function)

C کے ہر پروگرام میں ایک main()function ہونا ضروری ہے یوں تو آپ کے پاس ایک ہی ہے لیکن آپ اسے کوڈ میں کہیں بھی رکھ سکتے ہیں جو پروگرام ہمیشہ main() function سے شروع ہوتا ہے اسی وقت ختم ہوتا ہے جب main() functions میں موجود اقتباس (statement) ایگزیکیوٹڈ (executed) ہو جاتے ہیں۔ ہر فنکشن ایک قدر (value) پیش کرتا ہے۔

main() اس لیے خاص ہے کیونکہ یہ جواب میں ڈفالٹ (default) کے طور پر انٹیگر (integer) واپس کر دیتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں ;0 کی واپسی کا مطلب ہے کہ پروگرام بغیر کسی غلطی کے کامیابی سے چلا ہے۔

اگر آپ پروگرام کو بالکل اپنی جگہ سے ہٹا دینا چاہتے ہیں تو exit() کے اصول (function) کو استعمال کریں گے جو ایک پیرامیٹر.....ایک نمبر لکھے گا۔ اگر اس میں غلطی نہیں ہے تو وہ زیرو کو لے گا اور اگر غلطی ظاہر ہو رہی ہے تو زیرو کے علاوہ کچھ اور لے گا۔ لیکن آپ کو بہر حال <stdlib.h> include # کا استعمال کرنا پڑے گا۔

سیکولی بریکیٹ مارکس

main() کے بعد استعمال ہونے والے بریکٹ پروگرام گروپ بندی کرنے کے کام آتے ہیں۔ کھلے ہوئے بریکیٹ اور بند بریکیٹ کے درمیان کی چیز ایک ہی گروپ کا حصہ ہوتی ہے۔ اس گروپ بندی کو بلاک (block) کہا جاتا ہے۔ آپ کا پروگرام ہمیشہ کوڈ (code) کا ایک بلاک ہوتا ہے اور ایک بلاک کو دوسرے بلاک کے اندر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

Commenting Your Code

آپ پروگرام میں */ اور /* کے درمیان فقروں (comments) کا استعمال کر سکتے ہیں البتہ مرکب شدہ (nested) فقروں کی اجازت نہیں ہوگی۔

فقروں کے کچھ فائدے ہیں:

آپ کوڈ (code) دیکھنے والے شخص کو بتا سکتے ہیں کہ کوڈ کا کون سا حصہ کیا کام انجام دیتا ہے۔ یہ اس وقت مددگار ثابت ہوگا جب آپ اپنے کوڈ کو دوبارہ دیکھتے ہیں۔

کمپائلر تمام فقروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ فقروں سے پروگرام کی کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جب پروگرام میں غلطیوں کی بات آتی ہے تو آپ کوڈ (code) سے متعلق فقرے */ اور /* کے درمیان لکھ سکتے ہیں۔

فقرہ جاتی بند (commented code) کی کچھ مثالیں:

```
/* Comments spanning several */
/* lines can be commented */
/* out like this! */
/* But this is a more simpler way of doing it! */
```

□□□

محمد فیروز کوئز

اردو زبان و ادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) اردو زبان کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟
(الف) ہند یورپی (ب) ہند آریائی
(ج) افروایشیائی (د) ان میں سے کسی سے نہیں

(2) علم عروض کا موجد کون ہے؟
(الف) خلیل جبران (ب) ابوالحسن اخفس
(ج) خلیل بن احمد (د) یوسف نیشاپوری

(3) ''ارباب نثر اردو'' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) سید محمد (ب) سید محمود
(ج) سید احمد دہلوی (د) ڈاکٹر سید عبداللہ

(4) ''سنگھاسن بتیسی'' کا اردو ترجمہ کس نے کیا تھا؟
(الف) سید کاظم علی جواں (ب) حیدر بخش حیدری
(ج) للولال جی کوی (د) نہال چند لاہوری

(5) دلی کی شاعری میں کون سا احساس بہت گہرا ہے؟
(الف) روحانی (ب) خارجی
(ج) جمالیاتی (د) داخلی

(6) میر تقی میر کا انتقال کہاں ہوا تھا؟
(الف) اکبر آباد (ب) لکھنؤ
(ج) دہلی (د) فیض آباد

(7) جس نظم میں مدحیہ یا ہجویہ اشعار ہوں اسے کیا کہتے ہیں؟
(الف) مرثیہ (ب) واسوخت
(ج) قصیدہ (د) شہر آشوب

(8) کس نثری صنف کو دماغ کی ترنگ کہا جاتا ہے؟
(الف) خاکہ (ب) رپورتاژ
(ج) انشائیہ (د) افسانہ

(9) مولوی عبدالحق نے کون سا تذکرہ لکھا تھا؟
(الف) گلشن ہند (ب) گل رعنا
(ج) نکات الشعرا (د) تذکرہ المعاصرین

(10) ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کتاب کس نے لکھی تھی؟
(الف) میکش اکبر آبادی (ب) جگن ناتھ آزاد
(ج) وقار عظیم (د) یوسف حسین خاں

(11) انجمن ترقی اردو کے سب سے پہلے سکریٹری کون تھے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) الطاف حسین حالی
(ج) شبلی نعمانی (د) محسن الملک

(12) منقبتی اشعار کس کی تعریف میں لکھے جاتے ہیں؟
(الف) خدا (ب) رسول اللہؐ
(ج) بزرگان دین (د) پیغمبر

(13) ''ارمغان حجاز'' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) ماہر القادری (ب) شبلی نعمانی
(ج) اقبال (د) امیر مینائی

(14) ''مسدس حالی'' کا اصل نام کیا ہے؟
(الف) شاہنامۂ اسلام (ب) مدوجزر اسلام
(ج) طلوع اسلام (د) عظمت اسلام

(15) نظم ''آوارہ'' کے شاعر کا نام بتایئے؟
(الف) ساحر لدھیانوی (ب) جذبی
(ج) مخدوم محی الدین (د) مجاز لکھنوی

(16) مہاتما گاندھی کی سوانح عمری کا ترجمہ اردو میں کس نے کیا تھا؟
(الف) محمد مجیب (ب) عابد حسین
(ج) غلام السیدین (د) خواجہ احمد عباس

(17) ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' کا مصنف کون ہے؟
(الف) وقار عظیم (ب) جمیل جالبی
(ج) یوسف سرمست (د) عبدالسلام

(18) ذیل میں سے کون ''قدیم دلی کالج'' کا طالب علم نہیں رہا؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) ذکاءاللہ
(ج) میر ناصر علی (د) شبلی نعمانی

(19) اردو شاعری کا سب سے زیادہ سرمایہ کس صنف میں ہے؟
(الف) مرثیہ (ب) قصیدہ

(ج) غزل (د) رباعی

(20) یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
یہ شعر کس کا ہے؟

(الف) خواجہ میر درد (ب) مرزا محمد رفیع سودا
(ج) میر تقی میر (د) مرزا مظہر جان جاناں

(21) اردو شاعری کو درد و اثر اور سوز و گداز سے مالا مال کرنے والے شاعر کا نام بتایئے؟

(الف) میر سوز (ب) خواجہ میر درد
(ج) میر تقی میر (د) انعام اللہ یقین

(22) کس نے ادبی اور تفریحی اعتبار سے اردو ڈرامے کا معیار بلند کیا؟

(الف) امتیاز علی تاج (ب) آغا حشر کاشمیری
(ج) محمد مجیب (د) سید عابد حسین

(23) مثنوی "گلشن عشق" کس نے لکھی تھی؟

(الف) نصرتی (ب) وجہی
(ج) ہاشمی بیجاپوری (د) نظامی بیدری

(24) اس شعر کے خالق کا نام بتایئے؟
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

(الف) داغ (ب) حسرت موہانی
(ج) اقبال (د) شاد عظیم آبادی

(25) سرسید نے کس کے لحاظ سے اسلوب تحریر اختیار کیا؟

(الف) وقت (ب) زمانہ
(ج) موضوع (د) معاشرہ

(26) اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر کون تھا؟

(الف) امیر خسرو (ب) نصرتی
(ج) قلی قطب شاہ (د) ولی دکنی

(27) فورٹ ولیم کالج کی کون سی کتاب آج تک اردو نصاب میں شامل ہے؟

(الف) آرائش محفل (ب) باغ و بہار
(ج) سنگھاسن بتیسی (د) طوطا کہانی

(28) منٹو کے کس افسانے میں "سلطانہ" کا کردار ہے؟

(الف) ہتک (ب) دھواں
(ج) کالی شلوار (د) تین عورتیں

(29) کرشن چندر کے اولین "افسانوی مجموعے" کا نام بتایئے؟

(الف) نظارے (ب) طلسم خیال
(ج) زندگی کے موڑ پر (د) ان داتا

(30) مولانا ظفر علی خاں کس اخبار کے ایڈیٹر تھے؟

(الف) اودھ اخبار (ب) پیسہ اخبار
(ج) زمیندار (د) صدق جدید

(31) ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس کا صدر کون تھا؟

(الف) سجاد ظہیر (ب) اختر حسین رائے پوری
(ج) پریم چند (د) حسرت موہانی

(32) مدح کس شعری صنف کا جزو ہے؟

(الف) مرثیہ (ب) قصیدہ
(ج) واسوخت (د) مثنوی

(33) اردو مرثیے کے بیشتر اجزائے ترکیبی کس کی دین ہیں؟

(الف) میر خلیق (ب) میر ضمیر
(ج) مرزا محمد رفیع سودا (د) میر انیس

(34) عبدالحلیم شرر نے کس موضوع پر زیادہ ناول لکھے؟

(الف) رومانی (ب) اصلاحی
(ج) تاریخی (د) جاسوسی

(35) جوش ملیح آبادی کی پہلی نثری تصنیف کا نام بتایئے؟

(الف) یادوں کی برات (ب) روح ادب
(ج) سیف و سبو (د) چنگ و رباب

(36) ن م راشد کا شعری مجموعہ کون سا ہے؟

(الف) بازگشت (ب) نارسا
(ج) ماورا (د) جھنکار

(37) راجندر سنگھ بیدی کے لیے کس نے کہا تھا "اپنے کرداروں کے ذریعے خود ہم کلام نہیں ہوتے بلکہ اکثر ان ہی کی زبان لکھتے ہیں؟

(الف) وارث علوی (ب) اسلوب احمد انصاری
(ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) باقر مہدی

(38) اردو زبان کی نشو و نما میں کس نے اہم کردار ادا کیا ہے؟

(الف) علما (ب) صوفیا
(ج) فوج (د) بادشاہ

(39) کس شہر کے لیے کہا گیا تھا کہ "آہ" کی جگہ "واہ" کا دبستان کھل گیا؟

(الف) دہلی (ب) حیدرآباد
(ج) لکھنؤ (د) رامپور

(40) سرسید کے ہم عصر چراغ علی کا انتقال کب ہوا تھا؟

(الف) 1892 (ب) 1895
(ج) 1896 (د) 1898

(41) "سرشار اور سرور دونوں ہی نے لکھنوی طرزِ معاشرت کی آئینہ داری کی ہے....." یہ کس کا قول ہے؟

(الف) آلِ احمد سرور (ب) احتشام حسین

(ج) مجنوں گورکھپوری (د) احسن فاروقی

(42) ذیل کے شعر میں کون سی صنعت ہے؟

یک بیک گھبرا کے وہ اٹھا پکار

مار تیرے ہاتھ میں ہے اس کو مار

(الف) لف و نشر (ب) تجنیس

(ج) تلمیح (د) حسنِ تعلیل

(43) 1825 میں دہلی میں کون سا کالج قائم ہوا تھا؟

(الف) اینگلو عربک کالج (ب) دہلی کالج

(ج) ہندو کالج (د) سینٹ اسٹیفن کالج

(44) "انتخابِ دواوین" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) عبدالغفور نساخ (ب) مرزا علی لطف

(ج) امام بخش صہبائی (د) قدرت اللہ شوق

(45) کس ادیب یا شاعر کو "بھارت رتن" اعزاز سے نوازا گیا؟

(الف) فراق گورکھپوری (ب) ابوالکلام

(ج) خواجہ احمد عباس (د) مولانا عبدالماجد دریابادی

(46) حسرت موہانی نے رسالہ "اردوئے معلی" کب جاری کیا تھا؟

(الف) 1902 (ب) 1903

(ج) 1904 (د) 1905

(47) مندرجۂ ذیل میں سے رومانوی نثر کے لیے کس کو شہرت ملی؟

(الف) پریم چند (ب) عبدالحلیم شرر

(ج) مہدی افادی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(48) شعور کی رو کی تکنیک کس ناول میں سب سے زیادہ ہے؟

(الف) شکست (ب) گریز

(ج) آگ کا دریا (د) اداس نسلیں

(49) آلِ احمد سرور کی سوانح حیات کا نام کیا ہے؟

(الف) اپنی تلاش میں (ب) سلسلۂ روز و شب

(ج) خواب باقی ہیں (د) مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

(50) رباعی کا کون سا مصرعہ سب سے زیادہ پر اثر ہوتا ہے؟

(الف) پہلا (ب) دوسرا

(ج) تیسرا (د) چوتھا

ہمیں ستمبر کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

جانچ کے بعد قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **شاداں سلطانپوری**
معرفت سمیع پبلی کیشنز، بھٹی جرولی،
پوسٹ کٹاواں، ضلع سلطان پور، یوپی-228001

2. **علی داور**
معرفت ایم. ایچ. بکس،
رحم گنج، دربھنگہ-846004 (بہار)

3. **محمد انعام الحق**
933، کوچہ قابل عطار، چاندنی چوک، دہلی-110006

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔

آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

ستمبر انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. ب	2. الف	3. د	4. ج	5. ب
6. ب	7. ب	8. ب	9. د	10. ب
11. ب	12. ب	13. ج	14. ج	15. د
16. ج	17. ب	18. ج	19. ب	20. ج
21. ب	22. ج	23. ب	24. ج	25. ج
26. ج	27. ج	28. ج	29. ب	30. ج
31. ب	32. ج	33. ا	34. ب	35. ج
36. ب	37. ج	38. د	39. ب	40. ب
41. ج	42. د	43. ج	44. ا	45. ب
46. ج	47. ب	48. ج	49. ب	50. ب

محمد مسرور سعید

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔ 27

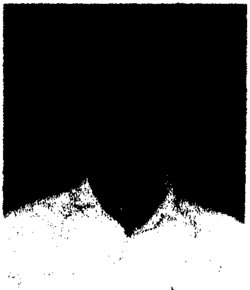

بڑھتے قدم

رئیس احمد نے ابتدائی تعلیم جامع مسجد اسکول، دہلی اور بی اے اور ایم اے کی تعلیم دہلی یونیورسٹی، دہلی سے حاصل کی۔ اسی دوران انھوں نے قومی اردو کونسل کے تحت چلائے جارہے ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس، بچوں کا گھر، دریا گنج، نئی دہلی سے امتیازی نمبروں کے ساتھ مکمل کیا۔ ان کا مختصراً انٹرویو قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: یہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور کوئی بھی قوم انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں قدم رکھے بغیر ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہوسکتی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں موجودہ حالات میں کمپیوٹر سے وابستگی ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: کونسل کے سینٹر کم قیمت پر بہتر درسی مواد کے ذریعے طلبہ کی رہنمائی کررہے ہیں۔ جبکہ دوسرے سینٹروں میں من مانا پیسہ بھی لیا جاتا ہے اور درسی مواد بھی غیر معیاری ہوتا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے اس سے میں پوری طرح مطمئن ہوں کیونکہ یہاں کی تعلیم و تربیت کا طریقہ بہت عمدہ ہے، تمام کتابیں آسان زبان میں دستیاب ہیں اور یہاں کی فیکلٹی بھی سبھی طلبہ کے ساتھ یکساں تعاون کرتی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کا یہ کورس DOEACC سے منظور شدہ ہے اور خاص طور پر اس کورس میں اردو پیکیج کی بھی تربیت دی جاتی ہے اس لیے یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کو روزگار کی فراہمی میں دیگر مراکز سے فارغین کے مقابلے میں زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بننے کے بعد میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے اور اپنے آپ کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ پاتا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بننے کے بعد میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے اور ساتھ ہی خود انحصاری کا احساس بھی۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ایک سے زیادہ زبانوں میں کام کرسکتے ہیں جو لوگ انگریزی اور ہندی کے ساتھ اردو بھی جانتے ہیں وہ زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، اس کی ادائیگی آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: یہاں پر جو فیس لی جاتی ہے وہ نہایت ہی مناسب ہے اور اس کی ادائیگی میرے لیے تو بوجھ نہ تھی لیکن غریب طلبہ کے لیے یہ ضرور بوجھ کہی جاسکتی ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

"اردو وژن پیپر کی تیاری اور اکیسویں صدی میں اردو کے فروغ میں قومی اردو کونسل کا رول" دو روزہ گول میز مذاکرہ

● نئی دہلی، 5 ستمبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 29 اور 30 ستمبر کو دو روزہ گول میز مذاکرے کا انعقاد کر رہی ہے جس میں اردو سے وابستہ اہم شخصیات کی شرکت متوقع ہے۔ مذاکرے میں اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے ایک وژن پیپر کی تیاری اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں قومی اردو کونسل کے رول پر تبادلۂ خیال کر کے مستقبل کا لائحۂ عمل طے کیا جائے گا۔

یہ گول میز مذاکرہ ترقی انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کی ایما پر ہو رہا ہے۔ انھوں نے قومی کونسل کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے ایک وژن پیپر تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا جس کو عملی جامہ پہنانے میں کونسل کے رول کا بھی ذکر ہو۔ اس وژن پیپر میں کونسل کے اختیارات اور تنظیمی ڈھانچے کی توسیع پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ جناب ارجن سنگھ نے اس کے لیے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دینے اور اردو سے وابستہ شخصیات سے صلاح و مشورہ کرنے کی بھی تجویز پیش کی تھی تاکہ وژن پیپر میں کم از کم مشترکہ پروگرام کے مطابق حکومت کی پالیسیوں پر عمل کیا جا سکے اور اردو کو ایک خاص طبقے سے جوڑنے کی کوشش کا تدارک کیا جا سکے۔

اس مذاکرے میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے نیز اس کی ترویج و ترقی کے لیے حکومت ہند کے ذریعے وقتاً فوقتاً وضع کردہ قوانین کا نفاذ، جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے وہاں اس پر عمل آوری، تمام ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کا نفاذ، حکومت کی نئی پالیسیوں کے نفاذ میں قومی اردو کونسل کے رول اور اس کے دائرۂ کار کو مزید وسیع کرنے پر بحث ہوگی۔ اس موقعے پر جو نکات زیر غور آئیں گے ان میں ابتدائی و ثانوی اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم کے لیے حکومت ہند کی ذمے داریاں اور اس کے لیے بلاواسطہ یا بالواسطہ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کو ریاستی حکومتوں یا قومی اردو کونسل کے ذریعے مالی امداد، اردو ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں کو خصوصی مالی تعاون اور اس کی نوعیت، اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے درسی مواد کی تیاری جیسے امور شامل ہیں۔

علاوہ ازیں اس مذاکرے میں جن نکات پر خصوصی توجہ دی جائے گی ان میں اردو کی تعلیم دینے والے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی درجہ بندی اور الحاق کے لیے قومی اردو کونسل کو قومی ادارے کا درجہ عطا کرنے، اردو زبان کے رسم خط اور تلفظ کے سلسلے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے، جدید سائنسی علوم سے اردو کو آراستہ کرنے، سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ، 2005 تا 2020 قومی اردو کونسل کا دائرۂ عمل اور اردو کے مسائل کے حل کے لیے ابتدائی اقدام کے طور پر سینٹرل مانیٹرنگ اتھارٹی (Central Monitoring Authority) کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔

ایک ثقافتی شام

● نئی دہلی، 27 اگست۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے الائنس فرانسز آڈیٹوریم، لودھی اسٹیٹ، نئی دہلی میں اردو کے معروف ادیب و شاعر اور فلم ساز گلزار اور پارسی تھیٹر سے وابستہ ممتاز فنکار محمد احمد انجم دہلوی کے اعزاز میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے مشترکہ کلچر کے فروغ میں اردو کے کردار پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اردو کی ترقی میں ثقافتی پروگراموں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو زبان اور تہذیب نے اس عظیم ملک کی تہذیب و ثقافت کو انفرادیت عطا کی ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش ہے کہ اردو زبان کی ان خدمات سے خاص و عام کو واقف کرایا جائے۔ اس موقعے پر دوردرشن کے لیے گلزار کی تیار کردہ منشی پریم چند کی دو کہانیوں ''کفن'' اور ''نمک کا داروغہ'' پر مبنی فلمیں بھی دکھائی گئیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، انیس اعظمی، محمود فاروقی اور دیگر اہم شخصیات شریک بزم رہیں۔ پارسی تھیٹر کے بارے میں انجم دہلوی کے ساتھ انیس اعظمی اور محمود فاروقی نے اسٹیج پر گفتگو کی اور پارسی اسٹیج کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر گلزار نے کہا کہ ''غالب'' سیریل بنا کر میں نے غالب کو مقبول نہیں کیا بلکہ غالب نے مجھے مقبول کیا۔ انھوں نے پریم چند کو ہندی اور اردو کا یکساں مقبول افسانہ نگار و ناول نگار بتاتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے غریبی اور بے روزگاری اور بدعنوانی کے جن مسائل کا ذکر اپنی کہانیوں میں کیا وہ آج بھی موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلموں اور ڈراموں کی زبان اردو سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ انجم دہلوی نے پارسی تھیٹر

کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندی اور اردو کے بہترین ڈراموں کے مکالمے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔

پی اے انعامدار مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے وائس چیئرمین مقرر

● نئی دہلی، 18 راگست۔ مرکزی وزارت سماجی انصاف وفلاح و بہبود نے اپنے تحت کام کرنے والے ادارے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا وائس چیئرمین پی اے انعامدار کو نامزد کرکے نئی کمیٹی کی تشکیل کردی ہے۔ اس کمیٹی میں سات نئے ممبران شامل کیے گئے ہیں۔ نامزد چیئرمین نے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے مہم چھیڑنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ پیر پاشی حسینی عبدالرزاق انعامدار (پی اے انعامدار) مہاراشٹر میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کام کررہے ہیں اور درجنوں میڈیکل وانجینیئرنگ کالجوں کے بانی ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سینیٹ کے ممبر، مسلم کوآپریٹیو بینک لمیٹیڈ کے ڈائرکٹر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی فنانس کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ فاؤنڈیشن کا خزانچی مدھیہ پردیش کی محترمہ مسرت شاہد کو بنایا گیا ہے اس کے علاوہ نئے ممبران میں اترپردیش کے غیور عالم، گجرات کے پروفیسر جے ایس بندوق والا، دہلی سے اصغر علی امام مہدی سلفی، کیرالہ سے ٹی پی ایم ابراہیم خاں اور ممبئی سے بدرالدین اجمل شامل ہیں۔ اس کمیٹی کی چیئرپرسن مرکزی وزیر سماجی انصاف محترمہ میرا کمار ہیں۔ پی اے انعامدار نے کہا کہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے جو خواب دیکھا تھا اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہی یہ ادارہ حکومت نے قائم کیا ہے۔ ادارے کی کوشش ہوگی کہ مسلمانوں میں مکمل تعلیمی بیداری کی مہم چلے۔ انھوں نے کہا کہ اچھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اچھے وسائل دستیاب ہوں اور حکومت مسلمانوں کو وسائل دینا چاہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری اولین ترجیح ہوگی کہ فاؤنڈیشن کے ذریعے گرانٹ جلد از جلد دی جائے۔ انھوں نے کہا کہ فاؤنڈیشن سرو شکشا ابھیان اور قومی اردو کونسل اور حکومت کے ذریعے چلائی جارہی دوسری اسکیموں کے ساتھ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری مہم شروع کرنے کی کوشش کرے گی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

منشی پریم چند کی یاد میں جلسہ

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے منشی پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر ایس ایل شرما (سابق صدر شعبۂ سماجیات) پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروگرام کی شروعات جناب کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی کے افتتاحی کلمات سے ہوئی جس میں انھوں نے پریم چند کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 1936 میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے جلسے میں منشی پریم چند کے خطبے نے نئے لکھنے والوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی اور ان کے افسانہ ''کفن'' نے ترقی پسند ادب کو ایک نئی راہ دکھائی۔ منشی پریم چند نے ہمارے سماج کے پس ماندہ طبقے کو سامنے لانے اور انصاف دلانے کے لیے آواز بلند کی۔ بعد ازاں چھ افسانہ نگاروں جناب آر ڈی شرما تاثیر، جناب کیدار ناتھ شرما، ڈاکٹر سلطان انجم، جناب راجندر ورما، ڈاکٹر رینو بہل اور جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اس سے قبل ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے منشی پریم چند کا شہرہ آفاق افسانہ ''کفن'' پڑھ کر سنایا۔ جناب آر ڈی شرما تاثیر کا افسانہ ''خط'' تقسیم ہند کے بعد پہلی نسل کے جذبات اور نئی نسل کے پس پردہ ہندوپاک کی مشترکہ قدروں کا ترجمان تھا۔ جناب کیدار ناتھ شرما نے افسانہ ''جھوٹن'' پیش کیا جس میں ہمارے معاشرے میں چھوٹے اور بڑے کے امتیاز کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر سلطان انجم نے افسانہ ''خواہشیں خواب ہیں'' پڑھا جس کا موضوع عہد جدید میں انسان کی محرومیاں اور سماجی ناہمواریاں تھا۔ جناب راجندر ورما نے اپنے افسانے ''اچانک'' میں دنیا کی چالبازی اور مکروفریب کی عکاسی کی۔ ڈاکٹر رینو بہل نے ایک رومانی افسانہ ''پانچ منٹ'' پیش کیا۔ آخر میں جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنا افسانہ ''چنار چنار چہرے'' پیش کیا جس میں وادیٔ کشمیر کے حالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس موقعے پر جناب ایس ایل شرما نے کہا کہ ادب کسی زبان کا ہو لیکن اس کی مقصدیت اور فکر مشترکہ ہوتی ہے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے لیکن منشی پریم چند نے ادب کے ذریعے سماج کو آئینہ ہی نہیں دکھایا بلکہ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ جناب شمس تمریزی نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

فراق کی یاد میں جلسہ

● گورکھپور، 29 راگست۔ منشی پریم چند، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری، بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو ادب کا یہ مثلث ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ لوگ روزانہ ہی آپس میں ملا کرتے تھے، کبھی مجنوں صاحب کی رہائش گاہ امام باڑہ، کبھی فراق صاحب کی کوٹھی لکشمی بھون اور کبھی نارمل اسکول میں منشی پریم چند پارک کے کوارٹر میں، جو آج قومی یادگار بن گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار فراق گورکھپوری کے یوم پیدائش پر ساجد علی میموریل کمیٹی کی جانب سے محمد حامد علی کی صدارت میں گلفشاں میں منعقدہ جلسے میں ایم کوٹھیاوی راہی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ فراق صاحب بقول خود ان دنوں ناگفتہ بہ حالات سے دوچار تھے۔ والد گورکھ ناتھ عبرت کا انتقال ہوچکا تھا، چھوٹی بہن کی شادی کرنی تھی، ایسے میں

منشی پریم چند اور مجنوں گورکھپوری کی رفاقت کام آئی۔ مجنوں گورکھپوری اور پریم چند کی صحبت نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو مہمیز کیا۔

جلسے میں پروفیسر افغان اللہ خاں صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے فراق کے فن اور شخصیت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ناظم جلسہ نے کہا کہ وہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے ایک بڑے نقاد بھی تھے۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا کمال جمالیاتی حس ہے اور رومانی انداز بیان بھی۔ انجینئر شمس انور نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔

آخر میں ایم کوٹھیاوی راہی نے یہ تجویز پیش کی کہ فراق کی ہمہ جہت شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے منشی پریم چند کے مکان کی طرح ان کے مکان لکشمی بھون کو حکومت اپنی تحویل میں لے کر اسے قومی یادگار کا درجہ تفویض کرے جس میں فراق کتب خانہ یا میوزیم قائم کیا جائے جہاں ان کے خطوط، مسودات، دستاویزات کو محفوظ رکھا جائے۔ گورکھپور یونیورسٹی کا نام فراق یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں فراق چیئر قائم کرنے کا مشورہ بھی مقررین نے دیا۔ قاضی توسل حسین ایڈوکیٹ، مقبول حسن لاری، آصف سعید، محمد سہیل، عاصم مسعود اور احمر الیاس نے بھی فراق صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رشید جہاں صد سالہ تقریبات

● نئی دہلی، 27 راگست۔ ''ڈاکٹر رشید جہاں شفیق اور وضع دار خاتون تھیں ان کے فکر میں تضاد نہیں ملتا، ان کے افسانے سماجی بغاوت کے نقیب تھے۔ انھوں نے نئی نسل کی قیادت کی۔'' ان خیالات کا اظہار شہرۂ آفاق ناول نگار قرۃ العین حیدر نے ڈاکٹر رشید جہاں کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر مذاکرے کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ یہ سیمینار ادبی تنظیم، بزم ہم قلم، دہلی اردو اکادمی اور صائم ایجوکیشنل کی جانب سے مشترکہ طور پر غالب اکادمی میں منعقد ہوا۔ صدر جلسہ افسانہ نگار جوگندر پال نے کہا کہ رشید جہاں نے افسانے کو وسعت عطا کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ رشید جہاں نے کم وقت میں ہمارے قلم کاروں کو بہت کچھ دیا۔ ان کی کہانیاں عورتوں کی بدحال زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں باغی کرداروں کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے رشید جہاں کی شخصیت اور زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رشید جہاں ایک بے باک اور نڈر خاتون تھیں اور کمزور طبقے کا درد اپنے دل میں رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ''انحراف کی آواز رشید جہاں'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ بعد ازاں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے۔ ابتدا میں نگار عظیم نے رشید جہاں کا افسانہ ''وہ'' پیش کیا۔ ڈاکٹر افشاں ملک (میرٹھ)، ڈاکٹر ثروت خاں (اودے پور)، غزال ضیغم (لکھنؤ)، ترنم ریاض (دہلی) اور ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے اپنے اپنے افسانے پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر نگار عظیم نے کی۔ ڈاکٹر ابن کنول، حقانی القاسمی، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر خالد محمود، شمائل احمد، ظہیر برنی، ڈاکٹر عفت زریں، ڈاکٹر نسرین جمال، انجم عثمانی، پیغام آفاقی، خورشید اکرم، ڈاکٹر مولا بخش، عظیم صدیقی، ممتاز عالم رضوی کے علاوہ دیگر صاحبانِ فکر کی کثیر تعداد نے جلسے میں شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

● لکھنؤ، 26 راگست۔ ''ساجھی دنیا'' کی طرف سے رشید جہاں کی صد سالہ پیدائش کے سلسلے میں ''مذہبی بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کے موضوع پر رائے اوما ناتھ بلی آڈیٹوریم قیصر باغ میں مذاکرہ منعقد ہوا جس میں معروف ادیبوں اور فنکاروں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ رشید جہاں کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انھوں نے خواتین کو ان کے حقوق کے تئیں بیدار کیا۔ رشید جہاں صرف ایک مصنفہ ہی نہیں تھیں بلکہ اسٹیج کے توسط سے بھی انھوں نے اپنی آواز لوگوں تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی تھی جس سے لوگوں میں بیداری آتی تھی۔ پروفیسر ردولوی نے کہا کہ ڈاکٹر رشید جہاں جیسے کردار کی آج سماج کو بہت ضرورت ہے۔ معروف ادیب شکیل صدیقی نے کہا کہ انھوں نے سب سے پہلے مسلم خواتین کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنے قلم اور ڈراموں سے ان میں اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ رشید جہاں پر منشی پریم چند کا بھرپور اثر تھا اور ان کی کہانیوں میں پریم چند کا اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو یونیورسٹی میں پروفیسر قمر رئیس کا خطبہ

● حیدرآباد، 5 رستمبر۔ ''علم کو رنگ و نسل، قوم و قبیلے اور سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ ان سب سے بالاتر ہے۔'' اس خیال کا اظہار پروفیسر قمر رئیس نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فاؤنڈیشن لیکچر سیریز کے تحت منعقدہ پہلے یوم اساتذہ خطبے کے دوران کیا۔ پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان، وائس چانسلر یونیورسٹی نے اس کی صدارت کی۔ ''وسطی ایشیا اور ہندوستان کے تہذیبی اور ادبی تعلقات'' کے زیر عنوان اس لکچر میں پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ وسطی ایشیا اور ہندوستان کے مابین علمی، مذہبی، تہذیبی و ثقافتی تبادلوں کے علاوہ قلمی تبادلوں کے باعث بھی ان کے رشتوں میں وقت کے ساتھ استحکام پیدا ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل وسطی ایشیا پر یونانیوں کے حملے کے بعد پشاور کے قریب ایک یونیورسٹی قائم کی گئی تھی جسے ٹکشلا یونیورسٹی سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں وہاں تقریباً نو سیکولر موضوعات بشمول طب کی تعلیم دی جاتی

تھی۔ اس یونیورسٹی میں وسطی ایشیا کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بدھ مذہب سے تعلق رکھنے والی اس یونیورسٹی کے تاشقند اور بخارا کے عجائب گھروں میں بہت سارے ایسے آثار موجود ہے جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والوں کے زیر اثر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں صوفیا کے سلسلے بھی وسطی ایشیا کے ممالک سے ہی ملتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ازبکی زبان میں بہت زیادہ مماثلت ہے چنانچہ غالب کا اردو اور فارسی کلام بھی ازبکی زبان میں ملتا ہے۔ الفاظ میں معمولی ترمیم و تبدل کے ذریعے اردو کے اشعار کا بآسانی ازبکی زبان میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس کی مثالیں بھی پیش کیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کے نمائندہ ادبا، شعراء، ماہرین تعلیم اور ناقدین کے فن اور شخصیت کے موضوع پر ازبکی طلبہ نے پی. ایچ. ڈی. کے مقالے لکھے ہیں۔ پروفیسر اے. ایم. پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اس موقعے پر اردو یونیورسٹی کی جانب سے فاؤنڈیشن لیکچر سیریز کے تحت منعقد کیے جانے والے پروگراموں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد، انچارج شعبۂ تعلقات عامہ نے جلسے کی نظامت کی جب کہ ڈائرکٹر ڈسٹنس ایجوکیشن پروفیسر کے آر اقبال احمد نے کلمات تشکر پیش کیے۔ اس موقعے پر اساتذہ، طلبہ اور اسٹاف کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ ’’کلام اقبال میں تصور خودسازی‘‘

● حیدرآباد، 18 راگست۔ علامہ اقبال نہ صرف ایک عظیم ترین عالم و فلسفی تھے بلکہ انھوں نے ایک پیغام رساں کی حیثیت سے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ترسیل و اظہار کا موثر ترین وسیلہ بنایا اور ادب برائے زندگی کے نظریے کو خاص اہمیت دی۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید فضل اللہ آئی اے ایس (کشمیر) نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک سیمینار ’’کلام اقبال میں تصور خودسازی‘‘ کے موضوع پر بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر ایس اے وہاب قیصر نے تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر سید فضل اللہ نے کہا کہ علامہ اقبال کے یہاں خودی وہ حرکت و توانائی ہے جو انسان کو اس سے آگاہ کرتی ہے کہ انائے مطلق کے بالمقابل وہ انائے محدود ہے۔ علامہ اقبال نے انسانیت کے لیے جمود ترک کرنے اور عمل پیرا ہونے کا پیام فلسفۂ خودی میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ خود سازی درحقیقت کئی چیزوں کا مرکب ہے لہٰذا غرور و تکبر اور رعونت سے بے نیاز ہوکر ہی خودی قائم رہ سکتی ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

تربھون یونیورسٹی نیپال میں اردو شعبہ بند

وائس چانسلر کی ہندوستان سے اردو استاد دینے کی درخواست

● کٹھمنڈو، 13 رستمبر۔ نیپال کی تربھون یونیورسٹی میں اردو کا استاد نہ ہونے کی وجہ سے شعبہ بند ہوگیا ہے۔ پہلے پاکستان سے اردو پروفیسر آتے تھے۔ مگر اس نے 2001 سے یہ سلسلہ بند کردیا۔ یونیورسٹی کی جانب سے متعدد درخواستیں کی گئیں مگر ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اب یونیورسٹی کے ذمے داروں نے ہندوستان سے درخواست کی ہے کہ وہ اردو پروفیسر فراہم کرے۔ دراصل نیپال اور پاکستان میں 1985 میں اس سلسلے میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت پاکستان اردو پروفیسر بھیجتا تھا اور تنخواہ بھی وہی دیتا تھا۔

شعبۂ سیاسیات کے سربراہ اور یونیورسٹی میں سینئر پروفیسر ایس. ایم. حبیب اللہ کے مطابق نیپال میں پندرہ لاکھ مسلمان ہیں جو اردو پڑھنا چاہتے ہیں اور اس کے تحت ہی یہ معاہدہ ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم نے ہندوستان کو لکھا ہے کہ وہ اردو پروفیسر بھیجے تاکہ شعبے کو دوبارہ شروع کیا جاسکے۔

یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ سطح کا اردو سرٹیفکیٹ کورس اور بیچلر ڈگری تک تعلیم دی جاتی تھی۔ 2001 تک اردو شعبے کے طلبہ کو فیس ادا کرنے کے لیے تین سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جارہا تھا۔ 1985 کے معاہدے کے بعد پاکستان نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ڈاکٹر طاہرہ نیر کو بھیجا تھا۔ انھوں نے دس سال تک اردو پڑھایا اور شعبے کو بیچلر ڈگری تک آگے بڑھایا۔ انھوں نے اپنی واپسی سے قبل وائس چانسلر کو دوسرا پروفیسر لانے کے لیے کئی خطوط لکھے۔ مئی 1997 میں وہ واپس پاکستان چلی گئیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبدالرؤف کوثر آئے اور انھوں نے اردو سبجیکٹ کمیٹی بنائی۔ مئی 2001 میں وہ بھی واپس چلے گئے۔ اس کے بعد سے یہ شعبہ بند ہے۔ اب یونیورسٹی نے اس کے لیے ہندوستانی سفارتخانے سے رابطہ قائم کیا ہے۔ (انڈین ایکسپریس، نئی دہلی)

تمل ناڈو اردو اکادمی کا جلسہ

● چنئی۔ تملناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کی پہلی نشست 8 راگست کو منعقد کی گئی جس کی صدارت ریاستی وزیر تعلیم اور تجارتی محصولات اور اردو اکادمی کے چیئرمین جناب بی. وی. شموگم نے کی۔ اس نشست میں پرنس آف آرکاٹ جناب محمد عبدالعلی وائس چیئرمین، اردو اکادمی، محکمۂ اعلیٰ تعلیم کے سکریٹری جناب کے. ایس. سری پتی آئی. اے. ایس.، اردو اکادمی کے سکریٹری اور رجسٹرار جناب کے. ایم. اشفاق الرحمٰن اور جناب جواہر نے شرکت کی۔ غیر

سرکاری ممبران کے طور پر جناب مختار بدری، ڈاکٹر سجاد حسین، ڈاکٹر کرامت اللہ بھٹی، جناب کے. ملک العزیز، حافظ ظفر الحق شاکر، ڈاکٹر حیات پاشاہ، ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا، محترمہ نسیمہ بیگم، جناب سی عبدالمالک اور جناب ایس. جی. محمد حسین جلسے میں شریک ہوئے۔ (ڈاک سے)

جھارکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ

● جمشید پور۔ تعلیمی وسماجی تنظیم اردو محاذ، جھارکھنڈ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ حکومت جھارکھنڈ کے محکمہ عاملہ، انتظامی اصلاحات اور راج بھاشا کی جانب سے حکومت نے ڈپٹی سکریٹری پنکج کمار مشرا کے دستخط سے 8 رفروری 2002 کو تمام ڈپٹی کمشنروں، سب ڈویژنل افسران، اور بلاک ڈیولپمنٹ افسران کے نام جاری سرکاری حکم نامے میں پوری صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بہار تشکیل نو قانون کے تحت حکومت بہار کے ذریعے جاری بھی قانون، ضابطے، حکم نامے جھارکھنڈ میں بھی نافذ ہیں۔ لہٰذا راج بھاشا محکمہ، پٹنہ کے مکتوب مورخہ 16 رجنوری 1996 میں دیا گیا حکم جھارکھنڈ میں تب تک نافذ رہے گا جب تک اسے تبدیل نہیں کر دیا جاتا۔ اس کے مطابق اردو پروگرام کے تحت تشکیل عہدوں کے بالمقابل تعینات ملازمین سے ہدایت شدہ کاموں سے مختلف کسی قسم کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ اس طرح 2002 میں ہی حکومت جھارکھنڈ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر چکی ہے لیکن نوٹیفکیشن جاری نہ کر کے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے معاملے کو الجھا دیا ہے۔ جھارکھنڈ میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ''اردو محاذ'' کی جانب سے ایک جلسہ پروفیسر شاہ حسن عثمانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انھوں نے جھارکھنڈ میں اردو کے حقوق کی حصولیابی کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں اردو زبان عزیز ہے اور ہم اس کی ترقی چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ خود بھی اردو لکھیں، پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی اردو پڑھائیں۔

صدر شعبۂ اردو جمشید پور ویمنس کالج پروفیسر ساغر برنی، ''اردو محاذ'' کے جنرل سکریٹری غالب اسلم، صدر افسر علی، مجلس مشاورت کے رکن ممتاز شارق، نائب صدر تسنیم عثمانی، سکریٹری امین احمد انصاری کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ''اردو محاذ'' کے ترجمان حافظ عارف احسن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی ادبی نشست

● بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی پندرہ روزہ ادبی نشست میں ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ان پروگراموں کے ذریعے اردو تخلیق کاروں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مل جاتا ہے اور وہ اپنی تخلیقات کے ساتھ سامعین کے روبرو ہوتے ہیں۔ اردو اکادمی اس طرح کی ادبی نشستوں کے ذریعے عوام میں ادبی مکالمے کو تقویت دینا چاہتی ہے۔ اس موقعے پر رضا رامپوری نے اپنی غزلیں پیش کیں اور سلطانہ حجاب نے اپنا افسانہ ''شکاری'' پیش کیا۔ تسیم انصاری، فرحت جہاں، ڈاکٹر راحت بدر، اقبال مسعود، انور حسین انور، بشر صہبائی، جگدیش شریواستو، رباب فاطمہ، جیتندر تیواری، علی عباس امید اور شہانہ نے بحث میں حصہ لیا۔

نشست کی ابتدا میں اردو قبیلہ کی طرف سے اردو اکادمی کیلی گرافی سینٹر کے طلبہ وطالبات کے خطاطی کے نمونوں پر محترمہ رباب فاطمہ زیدی کے ہاتھوں متین، ریشما اور فرزانہ کو انعامات دیے گئے۔ جلسے کی نظامت اقبال مسعود نے کی اور شاہ جہاں غنی سکریٹری اردو اکادمی نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ ''اردو تہذیب اور ثقافت''

● امروہہ، 24 راگست۔ مسلم گرلز انٹر کالج میں ''اردو تہذیب اور ثقافت'' کے عنوان پر منعقدہ مذاکرے میں حامد بہرائچی نے کہا کہ اردو زبان ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ حکیم سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ اردو زبان کی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کی ذمے داری جہاں نئی نسل پر ہے وہیں اس زبان کے ذریعے نام ونمود حاصل کرنے والے افراد کا فرض ہے کہ وہ نئی نسل کو اردو کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کریں۔

سیمینار میں آفتاب احمد سیفی، شبانہ پروین، کوثر علی عباسی، شاہد علی عباسی، ڈاکٹر ورشا سنگھ، رضوانہ، نور عباسی، نوشابہ اور نازنین نقوی کے علاوہ نیلم رستوگی، فاریحہ الطاف اور بیگم آفتاب موجود تھیں۔ پروگرام کی نظامت اقبال احمد خاں نے اور صدارت کے فرائض آفتاب احمد سیفی نے انجام دیے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

مظہر صدیقی کو شاہ ولی اللہ انعام برائے تاریخ نویسی

● نئی دہلی، 12 راگست۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نے پانچویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کا اعلان کر دیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مظہر صدیقی کو ''تاریخ نویسی۔ اسلامی تناظر میں'' کے لیے اس ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے تحت مضمون نگاری کے مقابلے میں چک منگلور، کرناٹک کی محترمہ نجم السحر اور لہریا سرائے بہار کے مفتی محمد سراج قاسمی کو مشترکہ طور پر انعام کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر منظور عالم کی صدارت میں شاہ ولی اللہ ایوارڈ بورڈ کی میٹنگ ہوئی جس میں سابق چیف جسٹس اے. ایم. احمدی، پروفیسر عبدالرحمٰن مومن، ڈاکٹر محمد حبیب، پروفیسر ظفر احمد نظامی، محمود علی اور انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری پروفیسر ظہور محمد خاں نے شرکت کی۔ اس ایوارڈ

کے تحت پروفیسر صدیقی کو ایک لاکھ روپئے نقد اور سپاس نامہ پیش کیا جائے گا۔ 2003 کے مضمون نویسی مقابلے کا عنوان ''انسانی حقوق'' تھا۔ 25000 روپئے کا یہ انعام مشترکہ طور پر دیا جائے گا۔ (قومی آواز، دہلی)

جلسۂ تقسیم اسناد

● نئی دہلی۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مدارس اسلامیہ کے غریب طلبہ کو روشناس کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ملک کے مختلف حصوں میں سیکڑوں کمپیوٹر سینٹر شروع کیے ہیں جہاں پر بے شمار طلبہ اور طالبات ان جدید علوم سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ انھی میں سے ایک مشرقی دہلی کا قدیم ترین مدرسہ زینت القرآن، ویلکم، سیلم پور ہے جہاں پر تقریباً چار سال سے کمپیوٹر سینٹر چل رہا ہے۔ 25 رجون کو مدرسہ ہٰذا کے کمپیوٹر سینٹر کے فارغین کو کانسٹی ٹیوشن کلب، رفیع مارگ، نئی دہلی میں سند اور ڈپلوما سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام میں جناب شعیب اقبال اسپیکر اسمبلی دہلی، چودھری متین احمد چیئرمین وقف بورڈ دہلی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، جناب عزیز برنی ایڈیٹر راشٹریہ سہارا (اردو) اور مولانا اعجاز احمد عرفی جنرل سکریٹری تنظیم علمائے حق دہلی وغیرہ نے اپنے خیالات اور مفید مشوروں سے سامعین کو نوازا۔ اس موقعے پر حکیم امام الدین ذکائی، مولانا سلیم انصاری، ڈاکٹر شمس الدین، ماسٹر انیس احمد، قاری محمد اشتیاق، مولانا عبدالستار، سلام قاسمی، محمد اسرائیل، علامہ منصور بجنوری وغیرہ بھی موجود تھے۔ نظامت کے فرائض فاخر بجنوری نے انجام دیے۔ اس موقعے پر جناب شعیب اقبال نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مدرسوں میں بھی آج عصری تعلیم دی جا رہی ہے۔ آج اردو اس لیے پیچھے ہے کہ روزگار سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنا ضروری ہے اور اس سلسلے میں قومی اردو کونسل بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے فارغین طلبہ و طالبات کو مبارک باد دیتے ہوئے اس تعلیمی سفر کو مزید رفتار دینے کی تلقین کی اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● ممبئی۔ رضوی ایجوکیشن سوسائٹی کے روح رواں جناب جاوید رضوی کی کاوشوں سے سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کی طویل علمی، ادبی و تدریسی خدمات کے اعتراف میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب یوسف ناظم نے کی۔ جلسے کے آغاز میں پرنسپل غلام عباس زیدی نے پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کا تعارف کرایا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید اختر حسن رضوی نے کہا کہ اقلیتی اداروں کی جانب سے چلائے جانے والے انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کو کم از کم ثانوی سطح کی حد تک ایک مضمون کی حیثیت سے طلبہ میں روشناس کرانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں رفیعہ شبنم جیسے اساتذہ کا تعاون درکار ہے جو اپنے دل کش انداز تدریس اور علمی صلاحیتوں کے وسیلے سے طلبہ میں ادبی ذوق اور دل چسپی پیدا کر سکیں۔ فیاض احمد فیضی نے رفیعہ شبنم عابدی پر ایک دل چسپ خاکہ پیش کیا۔ جلسے میں شمیم عباس اور مولانا ظہیر عباس نے بھی رفیعہ شبنم کی تدریسی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر مصطفےٰ پنجابی نے رفیعہ شبنم کے نام سے انٹر کالجیٹ بیت بازی مقابلہ ٹرافی کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ آفتاب حسین، ریحانہ اندرے، اسلم خان، ایڈوکیٹ ڈاکٹر مقبل احمد شیخ، نکہت سید اور عبید اعظم اعظمی نے جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے کی نظامت حامد اقبال صدیقی نے کی۔ محسن زیدی کے شکریے کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

● میرٹھ۔ گذشتہ دنوں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بزم اردو کی جانب سے پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مرکزی حج کمیٹی کے سابق رکن ذیشان خاں نے کی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے اردو افسانے کو ایک نیا موڑ دیا جس کی تقلید آج تک ہو رہی ہے۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر نریندر کمار مشرا اور منوج سریواستو نے شرکت کی۔ شعبے کی ایم فل کی طالبہ شاداب علیم نے اس موقعے پر پریم چند کی شخصیت اور خدمات پر مقالہ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت مشتاق صدف نے کی۔ (ڈاک سے)

● چنئی، 14 راگست۔ بزم طنز و مزاح، حیدرآباد، شاخ چنئی کی جانب سے ایس ضیاء الدین احمد صدر، سی عبدالحکیم ایجوکیشنل ٹرسٹ، چنئی کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں نواب عبدالعلی پرنس آف آرکاٹ، وائس چیئرمین، تمل ناڈو اردو اکادمی نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ اس موقعے پر محمد اشرف، ڈاکٹر محمد عبیدالرحمٰن احساس، فضل اللہ نے تقریریں کیں۔ معتمد مشاعرہ الطاف حسین شاداب تھے اور نجیب اشرف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے میں مسرور عابدی، عزیز بیلگامی، اختر علوی بنگلوری، حامد باقری بنگلوری، وقار گری، سید شکیل احمد شکیل، نور محمد جالب، امام قاسم ساقی، رفعت رحیم، وحید پاشا، راحت حرارت اور شاداب بے دھڑک نے اپنا کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● لکھنؤ۔ ممتاز اردو صحافی معصوم مرادآبادی کو اتر پردیش اردو اکادمی نے اردو صحافت کے خصوصی انعام سے نوازا ہے، جو کہ مبلغ 10 ہزار روپئے نقد اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ہفت روزہ ''خبردار جدید'' کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی گذشتہ 25 برس سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں دہلی

سے روز نامہ "جدید خبر" کی اشاعت بھی شروع کی ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی ان سے قبل جن صحافیوں کو اس ایوارڈ سے سرفراز کر چکی ہے ان میں عشرت علی صدیقی، حسن واصف عثمانی اور سابق ممبر پارلیمنٹ وصحافی خان غفران زاہدی شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

● مالیگاؤں، 5 اگست۔ انجمن محبان ادب نے اپنی پچاسویں ادبی نشست کے موقعے پر کل ہند افسانہ نویسی مقابلے کے نتیجے کا اعلان کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر الیاس صدیقی نے کی۔ سلیم شہزادے نے اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ اس مقابلے کے جج سجاد عزیز اور شبیر ہاشمی تھے۔ 59 افسانوں میں اول انعام علی محمود ("سونامی")، دوسرا انعام عبدالرحمٰن اختر ("ڈائری کھولتے ہی") اور تیسرا انعام محمد اسد اللہ ("آبگینہ") کو دیا گیا۔ تین اعزازی انعام بھی دیے گئے۔ جلسے کی نظامت طاہر انجم صدیقی نے کی۔ (ڈاک سے)

● میسور، 3 اگست۔ شعبۂ اردو جامعہ میسور، کرناٹک میں ممتاز رباعی گو شاعر جناب اصغر ویلوری کی آمد پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اصغر ویلوری نے شعبے کے طلبہ وطالبات سے خطاب کرتے ہوئے صنف رباعی کے فنی محاسن پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں شعبۂ اردو کے طلبہ، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ نے اصغر ویلوری کے ساتھ ادبی مذاکرے میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ شعبۂ اردو، جامعہ میسور نے مہمان خصوصی اور دیگر حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ اس ادبی اجلاس کی صدارت پروفیسر مسعود سراج صدر شعبۂ اردو نے کی۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 16 اگست۔ دہلی اردو اکادمی کی جانب سے یوم آزادی کے موقعے پر پیارے لال بھون میں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال نے کی جبکہ نظامت کے فرائض منور رانا نے انجام دیے۔ ریاستی وزیر ہارون یوسف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے بطور مہمانانِ خصوصی شرکت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں شعیب اقبال نے اردو کی بقا کے لیے اکادمی کی کوششوں کو سراہا۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ ہندوستان ہی ایسی جگہ ہے جہاں اردو مشاعروں کی روایت بدستور قائم ہے۔ اس روایت کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھانی چاہیے۔ دہلی حکومت میں اردو آفیسر ڈاکٹر اشفاق عارفی نے محکمۂ تعلیم کا اردو سے متعلق یہ اعلان بھی پڑھ کر سنایا کہ غیر اردو میڈیم اسکولوں میں پرنسپلوں کے پاس رجسٹر رکھے گئے ہیں۔ ان رجسٹروں میں اپنے بچوں کے نام اردو زبان کے خانوں میں درج کرائیں تاکہ حکومت کے لیے اس سروے کے بعد اردو اساتذہ کی تقرری اور ان کے لیے مراعات کی بہم رسانی کا فیصلہ آسان ہوجائے۔ مشاعرے میں ملک کے مشہور و معروف شعرا نے شرکت کی جن میں گلزار دہلوی، وسیم بریلوی، معراج فیض آبادی، واصف فاروقی، روبینہ شبنم، منور رانا، نور اندوری، قسیم امروہوی، ملکہ نسیم، جوہر کانپوری، ترنم کانپوری، نصرت گوالیاری، شعیب مرزا، اناد دہلوی، نظیر باقری، حسن کاظمی، سردار نرمل سنگھ نرمل، شکیل اعظمی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، منیر ہمدم، شمس تبریزی کے علاوہ تمیز الدین تمیز دہلوی، سردار پنچھی، پاپولر میرٹھی، شمس رمزی، اقبال فردوسی، یوسف منصوری، شکیل حسن شمسی اور ششانتی وید کول نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● نئی دہلی، 17 اگست، ینگ ریزیڈنٹس ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے بزرگ شاعر شاد فدائی دہلوی کے اعزاز میں ایک شام شاد فدائی کے نام کے عنوان سے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف صحافی احمد مصطفٰے صدیقی راہی اور نظامت معین شاداب نے کی۔ بطور مہمان خصوصی اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے شرکت کی۔ عظیم اختر نے شاد فدائی کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موصوف داغ اسکول کی بوسیدہ دیواروں کو اپنے ضعیف کاندھوں پر روکے ہوئے ہیں۔ مشاعرے میں پروفیسر مظفر حنفی، شاد فدائی، مخمور سعیدی، وقار مانوی، قیس رام پوری، ابرار کرتپوری، تابش مہدی، شمس رمزی، اعجاز انصاری، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، صالحین فہمی، صبا عزیز، سکندر عاقل، قاری فضل الرحمٰن، انجم رحمانی، وسیم راجپوری، راشد حامدی، دانش ایوبی، انور باری، شہباز ندیم ضیائی، اقبال فردوسی، ارشد ندیم، جاوید اعظمی، ممتاز نسیم، حسن کاظمی، معین شاداب اور بدر رشیدی نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● مونگیر، 16 اگست۔ رحمانی فاؤنڈیشن کی جانب سے نواب کوٹھی، بیلن بازار مونگیر میں آزادی کی انسٹھویں سالگرہ کے موقعے پر ایک شعری نشست منعقد کی گئی جس میں اردو اور ہندی کے مختلف شعرا نے شرکت کی جن میں شاہ محمد صدیقی، مولانا منظر قاسمی، فیاض رشک، مرزا مشکور بیگ، عبدالقیوم راہی، آنند جی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض آنند جی (ضلعی افسر رابطہ عامہ) نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

اردو پر کھلتا دریچہ

● نئی دہلی، 27 اگست۔ "ہندوستان میں اردو کے حق میں حالات اب اتنے سنگین نہیں رہے جتنے بیس پچیس برس پہلے تھے۔ اردو اور ہندی کی آمیزش سے جس ہندوستانی زبان کو سامنے لانے کی سیاسی کوششیں ناکام رہیں، وہ زبان بالی ووڈ کی ثقافت اور عالمیت کے نتیجے میں سامنے آرہی ہے۔" ان خیالات کا

اظہار سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال اور مشہور شاعر اور فلم ہدایت کار گلزار نے ممتاز اردو نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ ہندی کتاب '' اردو پر کھلتا دریچہ'' کی تقریب رونمائی میں کیا۔ گلزار نے اس کتاب کو افسانوں اور شاعری کے بعد تنقید کی سطح پر اردو اور ہندی میں قربت پیدا کرنے کا مستحسن قدم بتاتے ہوئے کہا کہ اردو تنقیدی تحریروں کی یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے جو ہندی میں شائع ہوئی ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے پچاس سالہ ادبی سفر میں کہیں نہیں رکے۔ بحیثیت نقاد و دانشور ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ معروف ہندی ادیب کملیشور نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی کتاب ان کے نزدیک نہ صرف اردو پر بلکہ ملی جلی ہندوستانی تہذیب پر کھلتا دریچہ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن، ممتاز ہندی ادیب ہربنش ترویدی، پروفیسر گنگا پرساد وِمل (?)، پروفیسر گیجر پانڈے اور پروفیسر نرملا جین نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ آج جنوبی ایشیا کی تقریباً 70 کروڑ آبادی اردو اور ہندی بولتی ہے۔ زبانوں کے رشتوں کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش جاری رکھنا کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ادیب کا فرض نامساعد حالات میں ہمت نہ ہارنا اور اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ میں نے اس کتاب کے ذریعے نفرت کی سیاہ خلیج کے کنارے روشنی کا ایک دیا روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ 600 صفحات پر مبسوط اس کتاب میں عہد بہ عہد اردو شاعری و فکشن کے ساتھ ساتھ تنقید کے سفر کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ ہندی رسم خط میں اس کتاب کو ارون مہیشوری (وانی پرکاشن) نے شائع کیا ہے۔

(ڈاک سے)

اردو تامل اور تامل اردو لغت کی ترتیب و تدوین

● چنئی، 15 / اگست۔ اردو اور تامل زبانوں کی تاریخ میں پہلی بار اردو تامل اور تامل اردو لغت کی ترتیب و تدوین عمل میں آئی ہے۔ چنئی کے راج بھون میں جناب سرجیت سنگھ برنالا نے گورنر تامل ناڈو کی ان لغتوں کا اجرا کیا۔ ان کی پہلی کاپیاں پرنس آف آرکاٹ نواب محمد عبدالعلی (وائس چیئرمین، تامل ناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی) اور محترمہ بدر سعید (چیئرپرسن، تامل ناڈو وقف بورڈ) کو پیش کیں۔ جناب برنالا نے اپنی تقریر میں ان لغتوں کو ان زبانوں کا سنگ میل قرار دیا۔ انھوں نے اردو کی موجودہ صورت حال پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اردو والوں کو اس زبان کی ترویج و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین نے اس جلسے کی نظامت کی اور ان لغات کے مرتب مختار بدری نے شکریہ ادا کیا۔ چنئی کے اردو اور تامل دانشوروں کی بڑی تعداد نے اس جلسے میں شرکت کی۔ (ڈاک سے)

تنقید

● علی گڑھ، 26 / اگست۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک موضوعی جریدے '' تنقید'' کے پہلے شمارے کا اجرا وائس چانسلر نسیم احمد نے کیا۔ اس شمارے کا موضوع '' اردو افسانے کی ایک صدی'' ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین اس کے مدیر اور قمر الہدیٰ فریدی معاون مدیر ہیں۔

پروفیسر قاضی افضال حسین نے رسالے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ اردو کا پہلا رسالہ ہے جو صرف تحقیقی و تنقیدی مباحث کے لیے مخصوص ہے۔ اس رسالے کے پہلے شمارے میں خالدہ حسین، پروفیسر مرزا حامد بیگ، فضیل جعفری، وارث علوی، پروفیسر قاضی افضال حسین، ڈاکٹر شکوہ محسن مرزا، ڈاکٹر خالد جاوید اور ڈاکٹر محمد عاصم رضوی کے مضامین شامل ہیں۔ ضمیمے کے طور پر علامہ راشد الخیری کے دو افسانے اس لیے شریک اشاعت کیے گئے ہیں کہ یہ شمارہ اردو افسانے کی ایک صدی کے لیے مخصوص ہے اور علامہ راشد الخیری کے یہ افسانے اردو کے پہلے افسانے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

□□□

اردو مرثیے کا ارتقا (ابتدا سے انیس تک)

مصنف: ڈاکٹر مسیح الزماں

مرثیے نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، تنوع اور وقار بخشا ہے اور تقریباً تین صدیوں کے سفر میں تہذیبی قدروں، ادبی تقاضوں اور مذہبی معتقدات کے زیر سایہ پرورش پاکر حیات و کائنات کے بہت سے پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کی یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب مرثیے کے آغاز سے اس کے ارتقائی سفر کے مختلف مدارج پر روشنی ڈالتی ہے اور اہم مرثیہ گو شاعروں کے فنی کارناموں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

صفحات: 468 قیمت: -/136 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

کلیات پریم چند (جلد سولہ) / مدن گوپال

صفحات: 516، قیمت:-/159 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: شبنم آرا

کلیات پریم چند کی سولھویں جلد پریم چند کے ڈراموں سنگرام، نیائے، ہڑتال اور چاندی کی ڈبیا پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ڈرامہ ''سنگرام'' ہے جو پریم چند نے ہندی میں لکھا تھا۔ اردو رسم الخط میں اس کا متن اس جلد میں پہلی بار شائع ہوا ہے، مرتب نے مشکل ہندی عبارت کے اردو مترادفات رقم کردیے ہیں۔

مرتب کے بقول ہر تحریر کے آخر میں اس کی پہلی اشاعت، جہاں شائع ہوئی ہے اس کتاب یا رسالے کا نام اور مقام اشاعت بھی درج ہوگا، لیکن عملی طور پر ایسا نہیں کیا گیا ہے۔

''سنگرام'' کے بارے میں پریم چند نے لکھا ہے:

''ڈراما لکھنے کے لیے موسیقی اور شاعری کا شوق ضروری ہے اور مجھے یہ دونوں شوق نہیں ہیں پھر بھی ''سنگرام'' کی کہانی ایسی ہے کہ اسے ناول کی شکل نہیں دی جاسکتی تھی، بہرحال اسے ڈرامے کی شکل دے رہا ہوں، آگے یہ بھول نہیں ہوگی، ڈرامے میں میرا یہ پہلا اور آخری دخل ہے...... کامیاب ہوسکوں گا یا نہیں، ایشور ہی جانے۔''

مگر ڈراما پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہیں اور اس کا موضوع کسانوں اور مزدوروں کی دکھ بھری زندگی ہے۔

''سنگرام'' کے علاوہ اس جلد میں تین ڈرامے اور ہیں ''نیائے''، ''ہڑتال'' اور ''چاندی کی ڈبیا'' جو بالترتیب گالزوردی کے ڈراموں ''جسٹس''، ''اسٹرا'' اور ''سلور باکس'' کے تراجم ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ گالزوردی کے ڈرامے ''اسٹرائف'' کا لفظی ترجمہ ''سنگرام'' ہوگا، ہڑتال نہیں۔ چونکہ ''سنگرام'' نام سے ایک ڈراما پریم چند پہلے ہی لکھ چکے تھے اس لیے شاید اس کا نام ''سنگرام'' کے بجائے ''ہڑتال'' رکھا۔

''نیائے'' میں مصنف نے ایک ایسے رحم دل انسان کی کہانی بیان کی ہے جو ایک ستم رسیدہ عورت کو انصاف دلانے کی خاطر خود ہی ناانصافی کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ فالڈر جو ڈرامے کا سب سے جاندار کردار ہے، ایک عورت کو اس کے ظالم شوہر کے شکنجے سے نجات دلانے کے لیے وہ کر گزرتا ہے جس کا اسے گمان تک نہیں ہوتا، اگرچہ وہ عورت بھی فالڈر سے بے پناہ محبت کرتی ہے لیکن اپنے شوہر کی بداخلاقی کے مدنظر وہ پس وپیش میں مبتلا رہتی ہے۔ فالڈر اس عورت کو زندگی کی تمام خوشیاں فراہم کرنے، اور اپنا شریک سفر بنانے کی خاطر اپنی جان دے دیتا ہے۔

''ہڑتال'' میں پریم چند نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ مزدور اپنے حقوق منوانے کے لیے کام کاج چھوڑ کر ہڑتال پر بیٹھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں لیکن کمپنی کے مالک پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور آخر کار مزدور بے بس ہوکر کام پر لوٹ آتے ہیں۔

''چاندی کی ڈبیا'' کا موضوع سماج میں اونچ نیچ کا امتیاز ہے۔ امیرزادے شراب اور دولت کے نشے میں چاہے کتنی ہی نازیبا حرکت کیوں نہ کرڈالیں، گھر کے تمام افراد ان کی پشت پناہی کرتے ہیں اور انھیں پیسے اور اثر ورسوخ کے بل بوتے پر بچا بھی لیا جاتا ہے لیکن ایک غریب انسان جس کے پاس نہ پیسہ ہے نہ اثر ورسوخ، اس کو بدکار ثابت کرکے جیل کی سلاخوں کے پیچھے کردیا جاتا ہے۔

گالزوردی کے ان تینوں ڈراموں کے ہندی ترجمے کا کام ہندوستانی اکادمی، الہ آباد کی طرف سے 1928 میں منشی پریم چند کو سونپا گیا تھا اور اردو ترجمے کا کام دیا نرائن نگم کو۔ ہندی ترجمے 1930 میں شائع ہوگئے لیکن دیا نرائن نگم اپنی دوسری مصروفیتوں کی بنا پر اردو ترجمے نہیں کرسکے، آخر میں پریم چند نے ''جسٹس'' کا ترجمہ ''انصاف'' کے نام سے کیا۔ پریم چند کی وفات کے بعد 1939 میں اس ترجمے کو ہندوستانی اکادمی نے دیا نرائن نگم کے نام سے شائع کردیا۔

متذکرہ چاروں ڈرامے زندگی کے ان گوناگوں مسائل کی عکاسی کرتے ہیں جن کے سامنے انسان بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ ڈرامے کردار نگاری کے بھی عمدہ نمونے پیش کرتے ہیں۔

کتاب کا سرورق عمدہ ہے لیکن کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں راہ پاگئی ہیں جنھیں آئندہ ایڈیشن میں درست کرنے کی ضرورت ہے۔

●

ادبیات شناسی / محمد حسن

صفحات: 192، قیمت:-/12.50 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: عظیم امروہوی

ادبیات شناسی بی اے اور ایم اے کے اردو طلبہ کو درس دینے والے اساتذہ کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اردو ادب کے جملہ مدرسین اور عام قارئین بھی

اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس میں ادب کی درسیات کے دو اہم مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے: ایک تو ادب کی پرکھ کا شعور، دوسرے ادب کے ذریعے اظہار و ترسیل کی تعلیم۔

ہر ادبی صنف ایک دوسرے سے مختلف اسلوب، زبان، لہجے اور مضامین کی متقاضی ہوتی ہے۔ اسی لیے سب کے اصول بھی الگ ہیں۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف نے ہر ادبی صنف کے افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے جو مصنف کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے اس کتاب کے دیباچے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ پہلے باب میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا ہے چونکہ بچوں کے لیے مادری زبان میں آموزش زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس باب میں اردو نثر کے چند اسالیب بھی زیر بحث آئے ہیں اور فارغ التحصیل طلبہ کے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف نے نصابات کی تاریخی ترتیب کو غیر مناسب بتایا ہے اور عملی امتحان پر زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق کے طریقۂ کار اور سندی تحقیق کی بعض خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

''ادبیات شناسی'' کے دوسرے باب ''مقاصد اور طریق کار'' میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مقصد کا واضح شعور تدریس کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مصنف نے زبان اور ادب دونوں کی تعلیم پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ تیسرا باب جمالیات کے موضوع پر ہے جو مختصر مگر جامع ہے۔ بقیہ سات ابواب اصناف ادب اردو کی درس و تدریس کے طریقۂ کار پر مشتمل ہیں جو اپنے موضوع کا پورا پورا احاطہ کرتے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور اساتذہ کے لیے ایسے رہنما خطوط متعین کر دیے ہیں کہ وہ زیادہ بہتر اور موثر ڈھنگ سے پڑھا سکیں۔ اساتذہ ''ادبیات شناسی'' کی روشنی میں علم کی روشنی زیادہ بہتر طریقے سے پھیلا سکتے ہیں۔

•

اللہ کے مقدس نام/ پرویز دیوان

صفحات: 364، قیمت: -/166 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: جاوید رحمانی

اردو زبان کی ابتدائی روایت مذہبی رہی ہے اور آج بھی اس کے سوتے خشک نہیں ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں نہ صرف اچھا خاصا مذہبی ادب موجود ہے بلکہ ہنوز لکھا جا رہا ہے۔ پرویز دیوان کی کتاب Allah-The Hallowed Names کا ترجمہ محمد اطہر نے کیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ''اللہ کے مقدس نام'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کی بنیاد جس سوال پر رکھی گئی ہے اس کی مذہب اسلام میں زیادہ اہمیت نہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے اور ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہے۔ پرویز دیوان کے مطابق ''عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، یعنی ایک کم سو، جس نے ان کو یاد کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسلامی دینیات کے مطابق اللہ کے تین ہزار نام ہیں، ان میں وہ نام بھی شامل ہیں جن کا ذکر عیسائی اور یہودی حضرات کی کتابوں میں موجود ہے۔''

مصنف ابن عربی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ ''نو سو سال قبل انھوں نے بھی اس موضوع کی تحقیق میں اچھی خاصی محنت کی تھی۔''

''اللہ کے مقدس نام'' میں اللہ کے اسما اور صفات کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ ان کے مطابق اس سلسلے میں دو رائیں ہیں: ''بعض محققین نے اللہ کے نام اور اس کی صفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں جبکہ اسلام اللہ کی بارہ سو صفات بتاتا ہے۔ ایک نظریے کے مطابق اللہ کے علاوہ تمام اسما صفاتی ہیں۔ اسی لیے اکثر محققین اپنے اسمائے حسنیٰ کی فہرست سے صفات کو خارج نہیں کرتے ہیں۔ فرائڈ لینڈر اور مظفر الدین کے بقول قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی کتابوں میں مذکور ننانوے نام قرآن میں موجود ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ فرائڈ لینڈر اور مظفر الدین نے کم سے کم 23 ایسے ناموں کا ذکر کیا ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ حالانکہ انھوں نے اس بات کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ ان کے اسمائے حسنیٰ کی فہرست قرآن سے ماخوذ نہیں ہے۔ مجھے اسمائے حسنیٰ کی ایک قطعی فہرست کی تلاش تھی، میں نے کئی فہرستوں کی طرف رجوع کیا، مجھ کو اکیس ایسی فہرستیں ملیں جو مکمل تھیں اور اس کے علاوہ دس جزوی فہرستیں اور عہد قدیم و وسطیٰ کی بہت سی مستند چیزیں ملیں۔''

بعد ازاں ''اسمائے حسنیٰ سے متعلق مختلف نظریات'' کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پہلے 13 ناموں اور ان کی ترتیب میں قریب قریب اتفاق ہے۔'' اور ''ننانوے نام کی حقیقت'' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''اسمائے حسنیٰ کی اکثر فہرستوں کے لیے ننانوے کی گنتی آئیڈیل ہے اسی وجہ سے اکثر لوگ جب اس موضوع پر لکھتے ہیں تو یہ عنوان باندھتے ہیں'' اللہ کے ننانوے نام'' جب کہ وہ خود ننانوے سے زیادہ ناموں کی فہرست پیش کرتے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے ہی بخاری شریف کے بارے میں ذکر کیا ہے جس میں 102 نام موجود ہیں، یسرنا میں (اللہ کو چھوڑ کر) 100 نام ہیں۔ نقری اور شمس کے یہاں بھی (اللہ کو چھوڑ کر) 100 نام ہیں۔ شاہ ہمدان کے اوراد میں 105 نام ہیں (بشمول اللہ، لیکن الہٰ کو

چھوڑ دیا ہے جس سے تعداد 106 تک پہنچ سکتی ہے)۔ اللہ کے ناموں اور صفات کی تعداد سے قطع نظر، گنج العرش کم از کم 114 القاب پر مشتمل ہے (اور یہ تعداد ان پانچ ناموں کو حذف کرنے کے بعد کی ہے، جن پر تمام محققین متفق ہیں: المجیب، الواسع، المجید، الہادی، الرزاق): مولانا مودودی نے 127 ناموں کا ذکر کیا ہے۔: شمع اور جیلانی کے یہاں علی الترتیب 156 اور 130 نام پائے جاتے ہیں۔''

مصنف نے ان ناموں کا مطالعہ اور تجزیہ بڑی بالغ نظری سے کیا ہے اور ''اجماع کی ایک فہرست'' بنانے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی کم معروف ناموں کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے مشہور غیر قرآنی ناموں کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح ان کی پیش کردہ فہرست 233 ناموں تک پہنچتی ہے۔ جو نام پوری اسلامی دنیا میں بہت زیادہ معروف و مقبول ہیں وہ 1 سے 99 تک رکھے گئے ہیں اور ''ضعیف ناموں'' کی بھی الگ سے تشریح و توضیح کردی گئی ہے۔ غرض کہ پوری کتاب اس موضوع سے مصنف کی والہانہ وابستگی اور علمی و تحقیقی مزاج پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب دلچسپ ہے اور امید ہے کہ قبول عام حاصل کرے گی۔

•

معلوم نامعلوم/شاعر: نشتر خانقاہی

صفحات: 128، قیمت: -/100 روپئے

ناشر: عاکف بکڈپو، کوچہ تاراچند، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: مخمور سعیدی

نشتر خانقاہی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تینوں ادبی میلانات کے غلبے کا زمانہ دیکھا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے شاید وہ منسلک بھی رہے لیکن ان میں خود آگہی اور خود شناسی کا جو جوہر ہے اس نے انھیں اس کا غیر مشروط مقلد ہونے سے باز رکھا۔ جدیدیت نے شعر و ادب میں انفرادی تجربے پر جو زور دیا، نشتر خانقاہی اپنی شاعری میں اس پر بھی لبیک کہتے نظر آتے ہیں لیکن اس رجحان میں زندگی کے لایعنی ہونے پر جو زور تھا، اس سے وہ دور دور رہے۔ نشتر خانقاہی کی شاعری ہنوز تازہ دم ہے اور یہ نتیجہ ہے اس خود اعتمادی کا جو ان کی فنی بصیرت نے انھیں بخشی ہے۔ بہر کیف ہمارے ادب اور ہماری شاعری کے ان تینوں طاقتور میلانات میں اگر کسی میلان سے وہ سب سے زیادہ قریب کہے جاسکتے ہیں تو وہ آخر الذکر میلان ہی ہے جو شعر و ادب میں کھلے پن کا نقیب ہے۔

اس سے پہلے نشتر خانقاہی کے چار شعری مجموعے ''میرے لہو کی آگ''، ''دسترس''، ''سرائے میں شام'' اور ''منظر پس منظر'' شائع ہو چکے ہیں اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان چاروں مجموعوں کا پرتپاک خیر مقدم ہوا ہے مگر ان مجموعوں کی موجودگی میں عصری شاعری کے اذکار میں نشتر صاحب کی شاعری کو جو جگہ ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی۔ اس کی وجہ کچھ تو ناقدین کی سہل انگاری ہے اور کچھ خود نشتر صاحب کا قلندرانہ مزاج جس کی وجہ سے ان کی کتابیں شاید ان تمام جگہوں تک پہنچ نہ سکیں جہاں پہنچنی چاہئیں تھیں۔ خود نشتر صاحب اس بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس کا اندازہ ''معلوم نہ معلوم'' کے دیباچے ''جھروکا کھلتا ہے......'' سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...... ادبی تحریکوں کی رہنمائی کرنے والوں نے ادیبوں، شاعروں کے سامنے خود ساختہ موضوعات پروسنے شروع کردیے۔ براہِ راست نہیں تو بالواسطہ...... ہوتے ہوتے سکّہ بند موضوعات کا ایک فیشن وجود میں آگیا...... مشینی ادب نے تخلیقی دیانتداری کو اتنا نقصان پہنچایا کہ اس کا اندازہ آسان نہیں ہے......''

نشتر خانقاہی سکّہ بند موضوعات کے حصار سے باہر کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ان کی اپنی زندگی کا عکس ہے جو انھوں نے لمحہ لمحہ جی ہے اور ہر لمحے کی دھمک اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں محسوس کی ہے۔ انھوں نے کائنات کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ اپنی تہذیبی اور ادبی روایت کے پروردہ تو ہیں لیکن اس روایت کو عصری تقاضوں سے کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے، یہ بھی انھیں معلوم ہے۔

نشتر صاحب یوں تو نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں لیکن غزل میں ان کی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ اپنی عیادت کی مجبوریاں
میں ہوں اور عالمِ کس مپرسی عجب

مکان کب منہدم ہوئے تھے، فلک فلک دھول کب اڑی تھی
فضا میں باقی نہیں رہا ہے گئے دنوں کا غبار بھی اب

عجیب بات ہے، دریا کے دو کنارے ہیں
اِدھر ہے صبح تو اُس پار شام ڈھلتی ہے

سچ کہوں تو یاد ہیں لے دے کے دو ہی حالتیں
بے خودی کی کج خرامی، ہوش کی شرمندگی

اب اکثر سوچتا ہوں میرا مرجانا ہی بہتر ہے
کہ بیماری میں ضد کرکے دوا دیتا نہیں کوئی

بعض غزلیں تو مطالبہ کرتی ہیں کہ پوری کی پوری نقل کردی جائیں مثلاً وہ غزل جس کا ذیلی عنوان ہے ''ضعیفی میں ایک یاد'' یا وہ غزل جس کا مطلع ہے:

حساب اپنا طلب کرتی ہے عمرِ رائگاں اکثر
چمک اٹھتا ہے تنہائی میں احساسِ زیاں اکثر

یا

لو کی تپش، کہ لطفِ صبا چاہیے مجھے
اب یہ بھی طے نہیں ہے کہ کیا چاہیے مجھے

نشتر صاحب پختہ کار شاعر ہیں مگر ایک آدھ جگہ ان سے کچھ سہو بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک غزل کا شعر ہے:

فلک پہ ہیں مگر بدلے ہوئے سے چہرے ہیں
کہاں چلے گئے کل کے فلک نشین بتا

مصرعۂ اوّل میں لفظ ''مگر'' وزن میں نہیں آرہا ہے اور دوسرے مصرعے میں ''فلک نشیں'' میں 'ن' کا اعلان فصاحت کے منافی ہے۔

نشتر صاحب کا سال پیدائش 1930 ہے یعنی اب وہ عمر کی 75 ویں منزل میں ہیں، ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس ان کی شاعری میں سر ابھار رہا ہے مگر وہ جس تواتر سے شعر کہہ رہے ہیں اور ایسے شعر کہہ رہے ہیں جنھیں نہ فکر اور جذبے کی سطح پر نہ اظہار کی سطح پر کمزور کہا جا سکتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا شاعر ابھی جوان بھی ہے اور فعّال بھی۔

•

تلخ و شیریں/ ابرار رحمانی

صفحات: 224، قیمت: -/125 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006
مبصر: ابوظہیر ربانی

''تلخ و شیریں'' ابرار رحمانی کے چھبیس تنقیدی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابتدائی چار مضامین بظاہر الگ الگ عنوانات کے تحت ہیں مگر مرکزیت اردو زبان کے مسائل کو حاصل ہے۔ آزادی کے بعد جو مسائل سامنے آئے ان میں اردو کا مسئلہ بھی بہت اہم تھا اور اس مسئلے کا ایک پہلو یہ تھا کہ بعض لوگ اسے محض ایک فرقے کی زبان قرار دینے لگے۔ ابرار رحمانی ایسے لوگوں سے سوال کرتے ہیں کہ اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کر لیا جائے تو ملک کے اول شہری صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی زبان اردو کیوں نہیں ہے جو ایک مسلمان ہیں؟ یا پھر اردو مسلمانوں کی زبان ہے تو ہندوستان کے ہندو جو اردو ادب کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، انھوں نے اردو کی تعلیم کیوں حاصل کی۔ فلم اور ٹیلی ویژن سیریل وغیرہ میں کثرت سے استعمال ہونے والے الفاظ بلا تفریق مذہب و ملت اردو کی مقبولیت کے بیّن ثبوت ہیں۔ انگریزوں نے اردو ہندی کا جو لسانی تنازعہ کھڑا کیا تھا، گاندھی جی اس سے واقف تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس تنازعے کے حل کے لیے قومی زبان ہندوستانی کا فارمولا پیش کیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی سے اردو ہندی دونوں مراد لیا تھا اور دونوں رسم الخط (اردو، دیوناگری) میں لکھنے پر زور دیا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ مگر مصنف اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر یہ بڑی زبان زبوں حالی کا شکار کیوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اردو کو تیسری بڑی زبان سمجھ رہے ہیں، وہ اردو زبان نہیں ہے بلکہ اردو الفاظ ہیں، جو دیوناگری رسم الخط میں لکھے جا رہے ہیں۔ ٹی.وی. یا فلم اسکرپٹ اردو نہیں دیوناگری رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں۔ اردو کی بگڑتی صورت حال پر مصنف کی گہری نظر ہے۔ اس ضمن میں صاحبانِ اردو کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے، خصوصاً ان لوگوں کو جو اردو کی روزی روٹی کھاتے ہیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے مضمون ''اردو کی عملی اور اصلی خدمت'' کے تحت یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کے موقعے پر ہر سال نومبر کو اردو ماہ کے طور پر منانا چاہیے۔ اس کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ مصنف نے ''ادب میں سرٹیفکیٹ کی روایت'' میں ادب میں تنقیدی، تحقیقی اور مرتبہ کتابوں پر انتساب یا پیش لفظ، حرف اول، حرف آخر، تقریظ یا فلیپ پر اس طرح کی آرا شامل کرنا جس سے مفاد پرستی اور چاپلوسی کی بو آتی ہو، گریز کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

''تنقیدی مکاتب فکر'' تنقید کے بدلتے ہوئے رجحانات پر ایک بسیط مضمون ہے جس کے مطالعے سے مختلف رجحانات و تحریکات کا پتہ چلتا ہے۔ ''قصہ ایک ادبی سروے کا'' ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے۔ پاکستان کے ایک رسالے نے بیسویں صدی کے دس بہترین ادیبوں کے انتخاب کے لیے جو طریقہ اپنایا تھا، اس میں اس کا معروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ شخصی نوعیت کے مضامین میں قاضی عبدالودود، شمس الرحمٰن فاروقی، انور عظیم، آل احمد سرور، دیوندر ستیارتھی اور کلیم عاجز جیسی شخصیتوں کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فکشن پر لکھے گئے مضامین بھی لائق توجہ ہیں۔ غضنفر کے ناول ''دویہ بانی'' کا تجزیہ بھی بہت خوب ہے۔ شعرا سے متعلق تین مضامین ہیں، جن میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور عرفان صدیقی کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ دیگر مضامین میں ''بیسویں صدی کے اردو ادب پر مطبوعہ کتابیں''، ''کویت میں اردو'' اور ''ہماری بے حسی اور ڈاکٹر ڈیسائی'' اہم مضامین ہیں۔

□□□

مصنف: شنکر   ”ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ“ (حصہ دوم) سے اقتباس   بچوں کا گوشہ

مترجم: خسرو متین

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں ”ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ“ سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔

ہندوستان میں دنیا کے دیگر ممالک کی بہ نسبت عوامی کہانیوں کا زیادہ رواج ہے۔ نانی اور دادی بچوں کی فرمائش پر کہانیاں سناتی ہیں جن میں تجسس اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ نصیحت کا پہلو بھی شامل رہتا ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل ”ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ“ میں ایسی ہی عوامی کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ چند عنوانات مندرجۂ ذیل ہیں۔ ”پنچھی بلی“، ”سوم دت اور مرا ہوا چوہا“، ”برہمن اور شیر“، ”قسمت“، ”جادو کی چارپائی“، ”نمک کی مٹھاس“، ”راجا اور توتا“۔ کونسل کی شائع کردہ 105 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 37 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

اجگر

بہت سال پہلے کی بات ہے ایک راجہ کی دو رانیاں تھیں۔ بڑی رانی شوبھا بہت اچھے مزاج کی اور رحم دل تھی۔ چھوٹی رانی روپا بڑی سخت اور تند مزاج تھی۔

بڑی رانی شوبھا کے ایک بیٹی تھی۔ نام تھا دیوی۔ رانی روپا کے بھی ایک بیٹی تھی۔ نام تھا تارا۔ رانی روپا بڑی چالاک اور لالچی عورت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ حکومت کی باگ دوڑ اسی کے ہاتھ میں رہے۔ راجہ بھی اس سے دبا ہوا تھا۔ رانی روپا، بڑی رانی اور اس کی بیٹی سے نفرت کرتی تھی۔ ایک دن اس نے راجہ سے کہا کہ رانی شوبھا اور دیوی کو راج محل سے باہر نکال دیا جائے۔ راجہ، رانی روپا کی ناراضگی سے ڈرتا تھا۔ اسے لگا کہ اسے وہی کرنا پڑے گا جو رانی روپا چاہتی ہے۔ اس نے بڑی رانی شوبھا اور اس کی بیٹی کو راج محل کے باہر ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کو بھیج دیا۔ لیکن رانی روپا کی نفرت پھر بھی کم نہیں ہوئی۔

اس نے دیوی کو حکم دیا کہ وہ روزانہ راجہ کی گایوں کو جنگل میں چرانے کے لیے لے جایا کرے۔ رانی شوبھا یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر دیوی گایوں کو چرانے کے لیے نہیں گئی تو رانی روپا انھیں اور کسی طرح سے پریشان کرے گی۔ اس لیے اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ

روز صبح گایوں کو جنگل میں چرانے کے لیے لے جائے اور شام کے وقت انھیں واپس لے آیا کرے۔

دیوی کو اپنا ماں کا کہنا تو ماننا ہی تھا، اس لیے وہ روز صبح گایوں کو جنگل میں لے جاتی۔ ایک شام جب وہ جنگل سے گھر لوٹ رہی تھی تو اسے اپنے پیچھے ایک دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''دیوی! دیوی! کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟''

دیوی ڈر گئی۔ جتنی جلدی ہو سکا اس نے گایوں کو گھر کی طرف ہانکا۔

دوسرے دن بھی وہ جب گھر لوٹ رہی تھی اس نے وہ آواز دوبارہ سنی۔ وہی سوال اس سے پھر پوچھا گیا۔

رات کو دیوی نے اپنی ماں سے اس آواز کے بارے میں بتایا۔ ماں ساری رات اس بات پر غور کرتی رہی۔ صبح اس نے فیصلہ کرلیا کہ کیا کیا جانا چاہیے۔

''سنو بیٹی!'' وہ اپنی لڑکی سے بولی۔

''میں بتا رہی ہوں اگر آج شام کے وقت بھی تمھیں وہی آواز سنائی دے تو تمھیں کیا کرنا ہوگا۔''

''بتایئے ماں!'' دیوی نے جواب دیا۔

''تم اس آواز کو جواب دینا'' شوبھا رانی نے کہا۔

''کل صبح تم میرے گھر آجاؤ۔ پھر میں تم سے شادی کرلوں گی۔''

''لیکن ماں!'' دیوی بولی ''ہم اسے جانتے تک نہیں۔''

''میری پیاری دیوی'' ماں نے دکھی ہوکر کہا۔ ''جن حالات میں ہم جی رہے ہیں اس سے زیادہ اور برا کیا ہوسکتا ہے؟ ہمیں اس پیغام کو قبول کرلینا چاہیے۔ ایشور ہماری مدد کرے گا۔''

اس شام جب دیوی گایوں کو لے کر گھر لوٹ رہی تھی اسے وہی آواز پھر سنائی دی۔ آواز نرم اور دکھ بھری تھی۔

''دیوی! دیوی! کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟ کیا تم مجھ سے شادی کروگی!''

دیوی رک گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ ہچکچائی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن پھر اسے ماں کے الفاظ یاد آگئے۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''ہاں! اگر تم کل صبح میرے گھر آجاؤ تو میں تم سے شادی کرلوں گی۔'' اور پھر وہ تیزی سے گایوں کو ہانکتی ہوئی گھر آگئی۔

اگلے دن صبح شوبھا رانی ذرا جلدی ہی اٹھ گئی۔ اس نے جا کر باہر کا دروازہ کھولا اور جھانک کر دیکھا، کہیں کوئی باہر کھڑا انتظار تو نہیں کر رہا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اچانک اسے ایک دھکا سا لگا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ایک بڑا اجگر (اژدھا) کنڈلی مارے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔

رانی شوبھا مدد کے لیے چلائی۔ دیوی اور نوکر بھاگے بھاگے آئے کہ کیا بات ہے؟ تبھی ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ اجگر بولا:

'نمسکار۔'' اس کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔

'' مجھے گھر آنے کی دعوت دی گئی تھی اس لیے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی بیٹی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں صبح گھر پر آسکوں تو وہ مجھ سے شادی کرلے گی۔ میں اس لیے آیا ہوں۔''

رانی شوبھا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ اسے تو یہ امید تھی کہ کوئی خوب صورت نوجوان اس کی لڑکی سے شادی کرنے آئے گا۔ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک اجگر ہوگا۔

ایک نوکر بھاگ کر رانی روپا کے پاس گیا اور اسے سارا واقعہ سنایا۔ رانی یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ وہ اسی وقت اپنے نوکروں کے ساتھ شوبھا کے گھر گئی۔

'' اگر راجکماری دیوی نے کسی کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا ہے تو اسے اپنا وعدہ ضرور نبھانا چاہیے۔ رانی ہونے کی وجہ سے یہ فرض ہے کہ میں دیوی کے وعدہ کو پورا کراؤں۔''

اسی دن دونوں کی شادی ہوگئی۔ رانی شوبھا اور دیوی کے لیے یہ کوئی خوشی کا موقع نہیں تھا لیکن اتنے دکھ تکلیف سہنے کے بعد بھی وہ کسی بھی پریشانی کا سامنا کرنے کو تیار تھیں۔ شادی کے بعد اجگر اپنی بیوی کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا۔

ساری رات شوبھا رانی نے دعا مانگتے گزاری کہ اس کی بچی ٹھیک ٹھاک رہے۔ دوسرے دن اس نے بڑے سویرے دیوی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خوب صورت نوجوان نے دروازہ کھولا۔ دیوی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

'' میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میری جان بچانے کے لیے میں آپ کا اور دیوی کا کس قدر احسان مند ہوں۔'' وہ نوجوان بولا:

'' میں ایک بددعا کی وجہ سے اجگر بن گیا تھا۔ ایک دن دیوتا نے مجھ سے ناراض ہوکر مجھے اجگر بنا دیا تھا۔ بعد میں انھیں اپنے اس کیے پر دکھ ہوا۔ تب انھوں نے کہا کہ اگر کوئی راجکماری مجھ سے شادی کرے تو میں پھر سے انسان بن جاؤں گا اور اب دیوی نے مجھ سے شادی کرلی ہے۔ میری بددعا اتر گئی ہے۔ اب میں پھر کبھی اجگر نہیں بنوں گا۔''

رانی شوبھا بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنی بیٹی اور داماد کو راجہ سے ملانے لے گئی۔ یہ بڑا عجیب وغریب واقعہ تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اس انوکھے نوجوان کو دیکھنے آنے لگے۔ سبھی مشتاق تھے۔ سوائے رانی روپا کے۔

رانی روپا بہت غصے میں تھی۔ اس نے جھلا کر اور جھینپ کر اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا۔ دیوی کی قسمت اس سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی تارا بھی ایسی ہی خوش نصیب بنے۔ آخرکار اسے ایک ترکیب سوجھی۔

اس نے اپنی لڑکی کو بلایا۔

'' دیوی کی شادی تو اب ہوگئی ہے۔'' وہ بولی۔

'' اس لیے گایوں کو چرانے تم جنگل لے جایا کرو۔''

''نہیں'' تارا چیخ کر بولی ''اتنے نوکر ہیں تو میں کیوں گائیں چرانے جاؤں۔''

''یہ میرا حکم ہے۔'' رانی غصہ ہو کر بولی۔ ''ایک بات اور بھی سن لو۔ اگر جنگل میں کوئی تم سے شادی کی بات کرے تو کہہ دینا میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ مگر وہ اگلے دن صبح ہمارے گھر آ جائے۔''

تارا ماں کے اس منصوبے سے خوفزدہ ہوگئی۔ وہ گایوں کو جنگل نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ خوب روئی، لیکن رانی پھر بھی نہیں پگھلی۔ تارا کو اس کا حکم ماننا ہی پڑا۔

تارا روز صبح گایوں کو جنگل میں چرانے کے لیے لے جاتی اور پھر شام کے وقت واپس لے آتی۔

لیکن اس نے ایک بار بھی کسی کی آواز نہیں سنی۔ جو یہ کہہ رہی ہو'' کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟''

پھر بھی رانی مایوس نہیں ہوئی۔ جنگل میں کوئی اجگر تو تھا نہیں، جو شادی کا پیغام دیتا۔ اس لیے اس نے خود اجگر ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے نوکروں کو ایک اجگر لانے کا حکم دیا۔ بہت تلاش اور کافی دن بعد انھیں ایک بہت بڑا سا اجگر ملا۔ اسے پکڑ کر وہ راج محل میں لے آئے۔

آخر کار رانی کا مقصد پورا ہوگیا اور اس نے تارا کی شادی اس اجگر سے کر دی۔ اب رانی کو اطمینان ہوا۔

شادی کی رات تارا اور اجگر کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ رانی بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہی تھی۔ رانی روپا نے سویرے ہی سویرے لڑکی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے ذرا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دروازہ تب بھی نہ کھلا۔ رانی نے اور انتظار نہیں کیا اور دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ موٹا اجگر زمین پر پڑا ہوا تھا مگر تارا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ رانی چیخ پڑی۔ محل میں سبھی نے اس کا چیخنا سنا۔ راجا اور نوکر بھاگے آئے کہ کیا بات ہے؟

''راجکماری کہاں ہے؟'' سبھی چلائے

''وہ تو اجگر کے پیٹ میں ہوگی۔'' باورچی بولا

''دیکھو یہ کتنا موٹا ہوگیا ہے۔''

رانی اب بڑے زور زور سے رونے لگی۔

باورچی اپنا سب سے بڑا چاقو لے آیا۔ وہ بولا۔

''اگر وہ اب تک زندہ ہوئی تو میں جان بچانے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے اجگر کا پیٹ چیر ڈالا۔ تارا زندہ سلامت تھی۔ باورچی نے اس باہر کھینچا۔ وہ چیخ مار کر اپنی ماں کی طرف بھاگی۔

اجگر مر گیا۔ ساتھ ہی رانی روپا کی یہ تمنا بھی مر گئی کہ اس کی بیٹی تارا کی شادی، دیوی کی طرح ہی کسی خوب صورت اور باصلاحیت نوجوان سے ہو۔

□□□

جناب گلزار اور جناب محمد احمد انجم دہلوی کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں لی گئی تصویر میں جناب سید شاہد مہدی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ڈاکٹر باراں رحمن ریڈر شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور دیگر حاضرین۔

گذشتہ دنوں جناب مختار بدری کی مرتب کردہ ''اردو تامل اور تامل اردو لغت'' کا اجرا تامل ناڈو کے گورنر جناب سرجیت سنگھ برنالا نے تامل ناڈو راج بھون میں کیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب مختار بدری، محترمہ وردانہ حیا، جناب شہزادہ پرویز، جناب سرجیت سنگھ برنالا اور نواب محمد عبدالعلی (پرنس آف آرکاٹ) چیئرمین تامل ناڈو اردو اکادمی۔

RNI NO. 70323/99

DL-15052/2003-5

URDU DUNIYA Monthly, October 2005, Vol. 7, Issue : 10

Date of Publication 24/09/2005

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi.

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

دیوان حسرت عظیم آبادی

مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی

حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے بھی شائع کیا تھا۔ یہاں کا مکمل دیوان ہے جس پر فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر بھرپور بحث کی ہے۔

صفحات: 484، قیمت: -/100 روپے

دکن میں اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

یہ کتاب دکنیات کے سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب کے بعض بیانات سے بعد کے محققین نے جو اختلاف کیا ہے پیش لفظ میں مصنف کی جانب سے اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

صفحات: 945، قیمت: -/102 روپے

خسرو شناسی

مرتبین: ظ۔ انصاری، ابوالفیض سحر

امیر خسرو کے لیے ایک شاعر نے کہا ہے:

[illegible]

[illegible]

اس کتاب میں حضرت امیر خسرو کی [illegible]

صفحات: 366، قیمت: -/80 روپے

دکن میں مرثیہ اور عزاداری

مصنف: ڈاکٹر رشید موسوی

دکن میں مرثیہ نگاری اور عزاداری کی روایت بہت قدیم ہے۔ [illegible]

صفحات: 315، قیمت: -/71 روپے

ذوق و جستجو

مصنف: خواجہ احمد فاروقی

"ذوق و جستجو" پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ [illegible]

صفحات: 400، قیمت: -/34 روپے

ہندوستانی دور وسطی کے مورخین

ترتیب و تدوین: محب الحسن، مترجم: مسرور ہاشمی

[illegible]

صفحات: 473، قیمت: -/174 روپے

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

اردو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ [illegible]

صفحات: 296، قیمت: -/111 روپے

"زمانہ" پریم چند نمبر

مرتب: دیا نرائن نگم، تصحیح اور مقدمہ: مانک ٹالا

"زمانہ" کا پریم چند نمبر [illegible]

صفحات: 310، قیمت: -/114 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938.